حیات اللہ انصاری نمبر

اکادمی

حیات اللہ انصاری مرحوم

1911-1999

اترپردیش اردو اکادمی

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081

دو ماہی **اکادمی** لکھنؤ

(دور دوم)

نمبر ۳، ۴، ۵

نومبر ۲۰۰۰ تا اپریل ۲۰۰۱

ایڈیٹر: محمد شاہد اللہ خاں

ترتیب

زرِ سالانہ : چالیس روپے =/40
قیمت فی شمارہ : آٹھ روپے =/8

اس شمارہ کی قیمت : چوبیس روپے =/24

مشاورت : اطہر مسعود رضوی

نگرانی : فدا حسین حسینی

معاونت : فرقان علی سلمانی

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ :

اتر پردیش اردو اکادمی
وبھوتی کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ ۲۲۶۰۱۰

ایس۔ سی۔ ورما، سکریٹری اتر پردیش اردو اکادمی نے میسرس براچی پرنٹرس اینڈ پیکجرس، اندرا نگر، لکھنؤ سے چھپوا کر اکادمی دفتر واقع وبھوتی کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ ۲۲۶۰۱۰ سے شائع کیا۔

اداریہ

حیات اللہ انصاری مرحوم کا نام جدید اردو صحافت کے ارتقائی سفر میں سنگ میل کا درجہ رکھتا ہے۔ انھوں نے لکھنؤ سے شائع ہونے والے اردو روزنامے 'قومی آواز' کے بانی مدیر کی حیثیت سے دیانت دارانہ، بے لاگ اور با اصول صحافت کی جو اعلا و ارفع روایت قائم کی وہ اردو صحافت کے سفر میں ہمیشہ مشعل راہ بن کر اجالا پھیلاتی رہے گی۔ اس زمانے کو گزرے زیادہ دن نہیں ہوئے جب انصاری صاحب، قومی آواز اور اردو صحافت تینوں کا شمار مترادفات کے زمرے میں ہوتا تھا۔ حیات اللہ مرحوم نے دنیا کے تاریک اور روشن، ہر پہلو کو بڑے قریب سے دیکھا بھی تھا اور بھگتا بھی تھا۔ وہ سچے گاندھی وادی تھے اور عوام کے دکھ درد کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ انھوں نے ظلم، استحصال اور فرقہ واریت کے خلاف عدم تشدد کے راستے پر چلتے ہوئے، علم بغاوت ہمیشہ بلند رکھا۔ ان کا کردار قومی آواز میں بھی جھلکتا تھا اور یہی سبب تھا کہ یہ اخبار متوازن ذہنیت رکھنے والے اردو داں طبقے کے دل کی دھڑکن بن گیا تھا۔

حیات صاحب کی دوسری حیثیت افسانہ و ناول نگار کی تھی۔ وہ اردو میں ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں بھی تھے اور عوام کے بہت قریب رہنے کی وجہ سے ان کے کرب کو اچھی طرح پہچانتے بھی تھے۔ انھوں نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں زندگی کے بہت سے مکروہ روپ دکھائے ہیں۔ پانچ جلدوں پر مشتمل ان کا ناول "لہو کے پھول" اردو کا ضخیم ترین ناول ہے۔ یہ محض ایک ناول نہیں بلکہ معاصر سماج،

تہذیب، ثقافت اور مختلف النوع لعنتوں کے خلاف عوام کے دلوں میں انگڑائیاں لیتی ہوئی آزادی کی خواہشات کی معتبر دستاویز بھی ہے۔

حیات اللہ انصاری صاحب اردو تحریک کے صف اول کے رہنماؤں میں سے تھے۔ انھوں نے طویل مدت تک صدر کی حیثیت سے اتر پردیش کی انجمن ترقی اردو کو فعال رکھا اور اردو کو اس کے آئینی حقوق دلانے کے لیے اکیس لاکھ دستخطوں پر مشتمل ایک محضر اس وقت کے صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد کی خدمت میں پیش کیا اور بالغوں کو اردو پڑھانے کے لیے "دس دن میں اردو" کے نام سے اپنی نوعیت کا مقبول ترین قاعدہ بھی لکھا۔

حیات اللہ انصاری تو اب لوٹ کر آ نہیں سکتے، البتہ ان کی حیات و خدمات اور ان کی دانش ورانہ صلاحیتوں کی مشعل نور ہاتھ میں لے کر نئی نسل آج بھی اپنے لیے نئی نئی جہتوں اور سمتوں کا تعین کر سکتی ہے۔

★★

حیات اللہ انصاری

ایک نظر میں :

پیدائش	:	۱۱ رمئی ۱۹۱۱ء، فرنگی محل، لکھنؤ
والد	:	مولوی وحید اللہ
والدہ	:	سائرہ بانو
شادی	:	۱۹۴۶ء، لکھنؤ
اہلیہ		سلطانہ بیگم
اولادیں	:	عیشت اللہ، سدرت اللہ
تعلیم	:	فاضل ادب۔ لکھنؤ یونیورسٹی، بی اے علی گڑھ یونیورسٹی
ادبی خدمات	:	پہلا افسانہ 'بڈھا سود خوار' (۱۹۲۷ء۔ جامعہ، دہلی)
	:	پہلا مارکسی افسانہ 'ڈھائی سیر آٹا' (۱۹۲۹ء۔ جامعہ، دہلی)
افسانوی مجموعہ	:	بھرے بازار میں (۱۹۳۲ء لاہور۔ کئی ایڈیشن)
دوسرا افسانوی مجموعہ	:	شکستہ کنگورے (۱۹۴۶ء لاہور۔ کئی ایڈیشن)
ناول	:	لہو کے پھول (۱۹۶۹ء۔ کتاب دان۔ ۵ جلدیں)
ناولٹ	:	مدار (۱۹۷۹ء۔ کتاب دان)
ناول	:	گھروندا (۱۹۸۰ء۔ کتاب دان)
تنقید	:	ن۔م راشد پر (۱۹۴۵)
	:	جدیدیت کی سیر۔ ۱۹۸۷ء
تیسرا افسانوی مجموعہ	:	ٹھکانہ (دہلی۔ ۱۹۹۲ء)

تعلیم بالغان	: دس دن میں اردو (۳۰ ایڈیشن)
	: دس دن میں ہندی (۲ ایڈیشن)
ناولٹ	: آخری سانس تک (زیر طبع)
صحافتی خدمات	: مدیر ہفت روزہ ہندستان (۱۹۷۳ء تا ۱۹۷۲ء)
	: بانی مدیر قومی آواز۔ لکھنؤ (۱۹۴۵ء تا ۱۹۷۲ء)
	: مدیر ہفت روزہ سب ساتھ (۱۹۸۲ء تا ۱۹۸۵ء)
	: مدیر ہفت روزہ سچ رنگ (۱۹۸۸ء تا مارچ ۱۹۹۰ء)
اردو خدمات	: برسہا برس اتر پردیش کی انجمن ترقی اردو کے صدر رہے۔ ان کی قیادت میں یو پی سے اکیس ۲۱ لاکھ دستخطوں سے اردو کو آئینی حقوق دلانے کے لئے اس وقت کے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد کو ایک یادداشت پیش کی۔
	: تعلیم بالغان کے لئے "دس دن میں اردو" کے نام سے ایک قاعدہ تیار کیا جس کی لاکھوں کاپیاں فروخت ہو چکی ہیں۔
فلم	: ۱۹۴۵ء میں ان کی کہانی کی بنیاد پر چیتن آنند نے "نیچا نگر" نام کی فلم بنائی جسے کینس کے عالمی فلم میلہ میں انعام ملا۔ بین الاقوامی انعام پانے والی یہ پہلی ہندستانی فلم تھی۔

(بہ شکریہ روزنامہ "صحافت"، لکھنؤ)
۱۹ فروری ۱۹۹۹ء

مسیح الحسن رضوی

حیات اللہ انصاری

اردو تہذیب کا ایک شاہ کار

یہ بھی ایک مذاق ہے کہ حیات اللہ انصاری جیسی عظیم شخصیت پر کچھ کہنے کی دعوت مجھے دی گئی ہے۔ بات کہاں سے شروع کروں اور کہاں ختم کروں یہ ایک آسان مرحلہ نہیں ہے۔ تعلقات کی عمر جب پچاس پچپن سال کو محیط ہو تو کہنے والے کو بڑی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔

غور تو کیجئے کہ میں نے ۳۸ء میں ایک خوش شکل، نرم خو، ہنس مکھ انسان کو اس کے ہندستان ویکلی کے دفتر میں دیکھا۔ میری ایک کہانی 'مزدور کا حرم' ان کے اخبار میں شائع ہوئی تھی اس کی اشاعت کے بعد شکریہ ادا کرنے ان کے دفتر گیا وہ اس وقت شاہد لطیف مرحوم سے گفتگو کر رہے تھے جب بات ختم ہوئی تو انھوں نے نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا، آپ کی تعریف؟ عرض کیا کہ مسیح الحسن رضوی۔ کرسی سے کھڑے ہو گئے، میری کرسی تک آئے اور بغل گیر ہو گئے۔ شاہد لطیف سے ملایا۔ خلوص سے ملے اور میری کہانی کی تعریف کی۔ غرض کہ دوسرے دن حیات اللہ صاحب نے وکٹوریہ اسٹریٹ پر اپنے مکان پر ناشتہ پر مدعو کیا۔ سادا سا مکان کچھ اور احباب بھی تھے، جن میں اس وقت امروہے کے تصویر حسین کا نام یاد آ رہا ہے۔ سب بڑی محبت سے ملے۔

ایسے لوگ اب دیکھنے کو نہیں ملتے۔ باتوں باتوں میں کرشن چندر کے نئے زاویہ کا ذکر آیا۔ انھوں نے اپنا افسانہ 'آخری کوشش' دکھایا جس نے اس وقت دھوم مچا رکھی تھی۔ بالکل اتفاق سے اسی دوران مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محل کی طرف سے نکل آئے، ان سے تعارف ہوا اور یہ تعارف، دانت کاٹی روٹی میں بدل گیا جو مرحوم کے انتقال تک قائم رہا۔ اسی خانقاہ میں مجاز، جذبی، سلام اور ہماری گلی کے پروفیسر احمد علی سے بھی آگے چل کر ملاقات ہوئی۔

یہ تھی حیات اللہ انصاری سے ملاقات کی ابتدا، پھر تو تعلقات بڑھتے ہی چلے گئے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ نقوش کے شخصیات نمبر میں ان پر میرا ایک مضمون شائع ہوا۔ لیکن یہ مضمون اس وجہ سے نامکمل ہے کہ حیات صاحب کی پچاس سالہ زندگی تک کے واقعات ہیں۔ وہ آگے چل کر جو بنے اس پر افسوس کہ میں کچھ نہ لکھ سکا۔ لیکن اس مضمون سے ان کی بھرپور شخصیت کا عکس تو سامنے آہی جاتا ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ ہنس مکھ انسان آگے کیا کچھ بنے گا۔ وہ بنے اور ایسے بنے کہ نہ ان نئے زاویوں سے فرنگی محل کا نام روشن کیا بلکہ لکھنوی تہذیب کو چار چاند لگا دیے۔ ادبی دنیا میں ایک قابل احترام ہستی بن گئے۔ "لہو کے پھول" لکھ کر کلاسیکی ادب کی سرحدوں میں داخل ہو گئے۔

دیکھنے میں وہ ایک زندہ دل اور مرنجاں مرنج قسم کے آدمی نظر آتے ہیں لیکن اندر سے وہ فولاد ہیں جس کو کسی زرہ بکتر کی ضرورت نہیں۔ اپنے خیالات کی پختگی میں وہ کسی سے سمجھوتہ نہیں کرتے لیکن اسی کے ساتھ دوسروں کے جذبات کا احترام کرتے ہیں۔ ان کے دوستوں میں ہر طرح کے لوگ شامل رہے ہیں۔ مولوی، مسٹر، شریمان، شیعہ سنی وہ سب۔۔ کے ہیں اور سب ان کا احترام کرتے ہیں۔ ایک بار انھوں نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ اپنی Grass Root سے نہ ہٹا کرو کہ تمھاری شناخت یہی وراثت ہے۔ عجیب انسان ہیں حیات اللہ انصاری صاحب، مارکس کو مانتے ہیں

اور اس کے ساتھ کٹر قسم کے گاندھیائی ہیں۔ گوشت کھاتے ہیں اور اہنسا کو مانتے ہیں۔ کانگرسی ہیں لیکن منافقانہ قوم پرستی سے کوسوں دور۔ ان کی اس افتادِ طبع نے انھیں بارہا سخت مشکلات میں ڈالا ہے لیکن انھوں نے اپنے عقائد سے کبھی انحراف نہیں کیا۔ یہاں جملۂ معترضہ کے طور پر ایک واقعہ کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ کوئی تیس برس پرانی بات ہے کہ محمود عباسی صاحب کی کتاب "خلافت معاویہ و یزید" آئی۔ بڑا چرچا ہوا، ہنگامے ہوئے، بحث و مباحثہ ہوا۔ مسلمانوں نے اپنی روایات کے مطابق مارنے اور مر جانے کی ٹھان لی۔ ایک دن لوگوں نے دیکھا کہ قومی آواز میں کتاب پر حیات اللہ انصاری کا قسط وار اداریہ شروع ہوا۔ کچھ لوگ خوش ہوئے کچھ ناراض۔ لیکن حیات صاحب نے پورے استقلال اور جواں مردی سے چھ قسطوں میں کتاب کے دلائل کی نفی کر دی۔ واہ وا، اور ہائے ہائے سے بے پروا ہو کر۔ جب وزیر تعلیم ایم۔ سی چھاگلا نے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے 'مسلم' کا لفظ حذف کیا تو انھوں نے بہت ہی بے باک ہو کر اس کی اداریہ کے ذریعہ خدمت کی۔ آخر میں انھیں کامیابی ہوئی۔

حیات اللہ انصاری کی سب سے بڑی خوبی میری نظر میں یہ ہے کہ اسلام پر ان کی نظر بہت گہری ہے۔ وہ اسلامی عقاید کو صحیح سیاق و سباق میں پرکھنے کا فن جانتے ہیں، وہ مسلکی تنازعوں میں نہیں پڑتے۔ اس خاکسار کو جب کبھی عقاید کے سلسلہ میں دشواری پیش آتی ان سے رجوع کرتا اور وہ کمال دیانت داری سے میرے مسلک کے مطابق رائے دے دیتے، شاید اس کا سبب مدرسہ فرنگی محل کی دینی تعلیم و تربیت تھی۔ اسی وجہ سے ماسکو نے انھیں اسلامک فلسفہ کے استاد کی سند دی تھی۔

قصہ مختصر اس ہشت پہلو شخصیت کے جتنے گوشے ہیں ان پر اس مختصر مضمون میں لکھا نہیں جا سکتا، اس لیے طوالت کو مختصر کرتے ہوئے ان کی صحافی زندگی پر کچھ عرض کر کے بات ختم کرتا ہوں۔

۱۹۴۵ء کی بات ہے ملک میں آزادی کے حصول کی تحریکیں اپنے اپنے رنگ میں چل رہی تھیں، ایک دن اچانک پیلی بھیت میں حیات اللہ انصاری کا خط ملا "چلے آؤ ضرورت ہے"۔ کیا ضرورت ہے کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ فوراً خط بھیجا کہ کرائے کا انتظام کر کے پہنچتا ہوں۔ خط ملتے ہی تار سے کرایہ آیا اور میں لکھنؤ کے لیے روانہ ہو گیا۔ یہاں آ کر معلوم ہوا کہ ایک کانگرسی روزنامہ، مرحوم رفیع احمد قدوائی کی سرپرستی میں نکل رہا ہے جس کے لیے نوجوان صحافیوں کی ضرورت ہے۔ مجھے پہنچتے ہی تقرری کا پروانہ مل گیا اور حیات اللہ انصاری نے آنکھ بند کر کے مجھے چیف سب اڈیٹر کا عہدہ سونپ دیا۔ بہت شور مچایا کہ میں اناڑی ہوں اس ذمے داری کو سنبھالنے کے لیے تجربہ کی ضرورت ہے، لیکن انھوں نے ایک نہ سُنی اور میری ہر دلیل کو کاٹ دیا۔ "کام کرو گے تو تجربہ آئے گا افسانہ نگار؟ یہ کام بھی سیکھ جاؤ گے"۔ پھر تو یہ کام میں نے ایسا سیکھا کہ ۳۲ برس تک قومی آواز سے منسلک رہا اور آج بھی اس کا بہی خواہ اور چاہنے والا ہوں۔

اخبار کیا تھا اس کا فیصلہ اس وقت کے قارئین نے کر دیا۔ لاہور کے ممتاز کمیونسٹ رہنما میاں افتخار الدین مرحوم نے جب امروز نکالنے کا ارادہ کیا تو سعادت حسن منٹو نے انھیں مشورہ دیا کہ اخبار نکالنا ہے تو حیات اللہ انصاری کے قومی آواز کے طرز پر نکالیے کہ وہ اردو اخبارات کا قافلہ سالار بن گیا ہے، انگریزی اخبارات سے آنکھیں ملا کر بات کرتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ حیات اللہ انصاری نے اس برصغیر میں اردو کی نئی صحافت کی ابتدا کی۔ ان کے اداریے غیر جذباتی اور مدلّل ہوتے تھے۔ وہ نہایت شیریں لب و لہجہ میں اپنی بات عوام تک پہنچا دیتے تھے۔ لیکن ان کی یہ ادائے صحافت 'منافقانہ قوی دستوں' کو کھٹکنے لگی اور انھوں نے قومی آواز سے ان کا پتہ کاٹنے کی مہم نہایت عیارانہ طور پر شروع کر دی۔ تنخواہ بند، خسارہ کا بہانہ مگر اس مردِ خدا نے رضا کارانہ طور پر کام کرنے کی پیش کش کی۔ یار لوگوں کے ہاتھوں کے توتے

اڑ گئے۔ کرنل بشیر حسین زیدی اور جناب رفیع احمد قدوائی نے سازش کو بھانپ لیا اور حیات صاحب کو ان کے عہدہ پر بحال کر دیا۔ لوگ یہ نہیں چاہتے تھے کہ حیات اللہ اخبار کے ذریعہ اردو اور مسلمانوں کی فلاح اور ترقی کی بات کریں۔ لیکن اس باہمت انسان نے قومی آواز کو جب تک وہ ادارہ میں رہے، اپنے مشن پر لگائے رکھا۔ علاحدگی کے بعد انھوں نے دلی سے 'سب ساتھ' ویکلی نکال کر اپنے مشن کو جاری رکھا اور شاید آج بھی وھیل چیر پر بیٹھ کر وہ اپنے مشن کو کامیاب ہوتے دیکھنا چاہتے ہیں۔ آج وہ زندگی کی اس منزل میں ہیں جہاں انھیں ہار پھول پہنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ مخالفوں نے تو انھیں قتل کر ڈالنے تک کا پروگرام بنایا تھا۔ لیکن جسے خدا رکھے اسے کون چکھے کے مصداق وہ بھرپور زندگی گزار کر اب آرام کر رہے ہیں۔

ان کی زندگی کے ان گنت کاموں میں سے ایک عظیم الشان کام دستخطی مہم ہے۔ جن کے ذریعہ انھوں نے بیس لاکھ دستخط جمع کر کے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد کو اردو کا استغاثہ پیش کیا لیکن حیف کہ راشٹرپتی بھون میں اس دستاویز کو دیمک چاٹ گئی اور اردو اتفاق سے اب تک محروم ہے۔ محروم اس لئے کہ اب اردو کے سوداگر تو ہیں لیکن مخلص، بے لوث کام کرنے والے نہیں۔ شور ہے ہوش نہیں۔

آج اس ہال میں اردو کے اس معتبر خدمت گار کو خراج عقیدت پیش کرنے والے مجمع میں کتنے ہیں جو حیات اللہ کے فن اور شخصیت سے وجدان حاصل کیے ہوئے ہیں، افسوس کہ کوئی بھی نہیں۔ لیکن ان سے سیکھئے وہ اردو تہذیب کے انمول رتن ہیں، اس کی آبرو ہیں۔

آخر میں اپنی طرف سے اور آپ سب صاحبان کی طرف سے حیات اللہ انصاری کو ان کی نوّے سالہ کامیاب زندگی گزارنے پر ہدیۂ مبارک پیش کرتا ہوں اور خدا سے دعا کرتا ہوں کہ ان کا سایہ آپ سب پر قائم رہے اور آپ ان کی زندگی کے کارناموں سے سبق لے کر اردو تہذیب کے لیے اپنا کچھ وقت صرف کر سکیں۔

(باقی صہ۲۴ پر)

حیات اور عزمِ ترقی

فرنگی محل سے متّصل وکٹوریہ اسٹریٹ پر بزازے میں واقع ایک مکان کی پہلی منزل پر مولوی حیات اللہ انصاری سے ملنے کا اتفاق ہوا، مجھے وہاں تک میرے دو دوست مفتی رضا انصاری اور فرحت اللہ انصاری (سابق مدیر "نیا دور") لے گئے۔ دونوں ان کے عزیز تھے مگر ان سے علمائے فرنگی محل کے خاندان سے وابستگی کے علاوہ دوسری خصوصیات بڑی حد تک مختلف تھیں۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم فرنگی محل جیسے مشہور مرکزِ علم میں پائی اور تینوں کو ادبیات سے گہرا لگاؤ تھا۔ یہ غالباً ۳۵-۱۹۳۴ء کی بات ہوگی سامنے کے کمرے کے پیچھے جو صحن تھا اس میں کچھ گھڑے نظر آئے جن کے دہانے پر کپڑے بندھے ہوئے تھے۔ حیات اللہ صاحب نے صحن سے کمرے میں آکر میرا استقبال کیا اور ابتدائی تعارف میں ساتھیوں نے یہ راز فاش کیا کہ ان گھڑوں میں حیات اللہ صاحب نے کچھ سانپ پال رکھے ہیں اور ان کی دیکھ بھال کرتے رہتے ہیں۔ یہ انکشاف کچھ عجیب مگر دل چسپ معلوم ہوا کہ نام حیات، تعلیم گاہ فرنگی محل اور ادبیات سے واضح دلچسپی کے باوجود بالکل ہی متضاد طبیعت ورجحان کی مخلوقات پر توجہ مرکوز تھی۔ کورس میں سانپوں کو دودھ پلانے کا محاورہ فوراً ذہن میں گونج اٹھا۔ اس دل چسپ انکشاف کے بعد یہ تصوّر دشوار نہیں تھا کہ وہ دوست دشمن ماحول اور وحشت ناک

فطرتوں کی گود سے بھی یکساں طور پر افسانہ نگاری کے پہلو نکال سکتے تھے۔
تقریباً اسی زمانے میں مشہور علمی درسگاہ سلطان المدارس کے طلبا میں کچھ بے چینی کے آثار تھے اُن کا بھی ذکر چھڑا کہ وہاں کے طلبا اسٹرائک کا منصوبہ بنا رہے ہیں اور اس کی قیادت میرے چھوٹے بھائی مولوی سید علی سجاد صاحب فرما رہے تھے۔ ان کی کوشش یہ تھی کہ دوسرے عربی مدارس کے طلبا کی تائید بھی حاصل کی جائے، یہ مسئلہ ہمارے وہاں پہنچتے ہی چھڑ گیا اور یہ معلوم ہوا کہ کیفی اعظمی بھی اس تحریک میں حصّہ لے رہے ہیں وہ خود بھی سلطان المدارس کے طالب علم تھے اور پتہ چلا کہ وہ تحریک کی موافقت میں کوئی نظم بھی لکھ رہے ہیں۔ یہ سب معلومات آج کے پڑھنے والوں کو افسانہ معلوم ہوں گی مگر یہی حقیقت تھیں۔
حیات صاحب سن میں مجھ سے کم و بیش پانچ برس بڑے تھے، تذکرۂ ماہ و سال میں پیدائش کا سن ۱۹۱۱ء اور پروفیسر اعجاز صاحب کی "مختصر تاریخ ادب اردو" میں ۱۹۱۲ء درج ہے وہ کچھ دنوں پہلے سے افسانے لکھنے لگے تھے۔ اُن کا پہلا مجموعہ "بھرے بازار میں" ۱۹۳۵ء میں لاہور سے شائع ہو چکا تھا۔ ظاہر ہے افسانہ نویسی کا آغاز پہلے ہی ہو چکا ہوگا اور ان کے افسانے توجہ کا مرکز بھی بننے لگے ہوں گے۔
حیات اللہ انصاری کے افسانوں کے کردار عموماً جفاکش اور کمزور طبقوں سے تعلق رکھنے والے ہوتے ہیں (ان کے افسانوں میں روٹی کا مسئلہ اتنے واضح طور پر سامنے آتا تھا کہ دوستوں کے قریبی حلقوں میں ان کا نام ہی حیات اللہ روٹی پڑ گیا تھا)۔ یہ قریبی حلقہ مجاز لکھنوی، سبط حسن اور پروفیسر سید احتشام حسین جیسے صاحبانِ کمال پر مشتمل تھا۔ اس زمانے میں علی عباس حسینی، نیاز فتح پوری اور مجنوں گورکھپوری جیسی قدآور ہستیاں بھی افسانہ نویسی کے افق پر نمودار ہو چکی تھیں اور پریم چند ان میں زیادہ سر برآوردہ تھے۔
اس دَور کے لکھنؤ میں احمد علی، رشید جہاں اور سجاد ظہیر نے 'انگارے' جیسے افسانے لکھ کر سارے افسانوی افق کو چمکا دیا تھا، بعد میں حیات اللہ انصاری

بھی اس حلقے کے قریب آکر ترقی پسند افسانوی ادب کے دوسرے نمائندوں کرشن چندر اور اختر حسین رائے پوری کے قریب آگئے تھے۔ ۱۹۳۶ء میں جب پریم چند کی صدارت میں پہلا ترقی پسند مصنفین کا اجلاس رفاہ عام کلب میں منعقد ہوا تو حیات صاحب ترقی پسندوں کے نزدیک پہنچ چکے تھے لیکن ان کا مزاج شروع ہی سے گاندھیائی تھا اس پر فرنگی محل کی چھاپ تھی اور یہاں مولانا عبدالباری صاحب تحریک خلافت اور قوم پروروں کے جذبات کی پرورش میں پیش پیش تھے اس لیے سیاسی اور ادبی طور پر وہ ترقی پسندی اور قوم پروری دونوں ہی کا قدرے مجموعہ تھے اور ان کی تحریروں میں ان کی نمایاں آمیزش ملتی ہے۔ اس دور میں انھوں نے مشہور لیڈر جناب رفیع احمد قدوائی مرحوم کی اعانت سے "ہفتہ وار ہندوستان" کے نام سے نکالا۔ ہماری اکثر ملاقاتیں اسی کے دفتر میں ہوتی رہیں اور ان کو زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔

اکثر کئی شخصیتوں میں ادب اور صحافت کا یکساں امتزاج ملتا ہے۔ حیات اللہ انصاری بھی بیک وقت اچھے صحافی بھی ہیں اور اچھے افسانہ نویس و ناول نگار بھی، صحافت میں "ہندوستان" کے بعد وہ مشہور روزنامہ "قومی آواز" کے مدیر کی حیثیت سے نمایاں ہوئے۔ غالباً یہ ہمارا پہلا روزنامہ تھا اردو کے بیشتر روزناموں نے اس کے نقش قدم کو اپنایا اور انگریزی روزناموں کی طرح اعتبار کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ خبروں کی فراہمی کا اچھا انتظام تھا۔ اچھی نیوز ایجنسیوں کی خبریں براہ راست ترجمہ کی جاتی تھیں اور ان پر مناسب سرخیاں دی جاتی تھیں۔ خاص ایڈیٹوریل حیات اللہ صاحب خود لکھتے تھے، ادارتی نوٹ اسٹاف کے دوسرے ممبران کے فکر و قلم کا نتیجہ ہوتے تھے۔ کمرے میں حیات اللہ صاحب نے ایک بڑا بلیک بورڈ لگوا دیا تھا روزانہ صبح کو پورے اخبار کا اسٹاف کے مختلف لوگ جائزہ لیتے تھے اور اگر کوئی کمی یا کوتاہی ہوتی تھی بلیک بورڈ پر لکھ دی جاتی تھی۔ اصطلاحات کے ترجموں کی دیکھ بھال ہوتی تھی اور جہاں ضرورت ہوتی ان اصطلاحات کا ترجمہ آئندہ کے لیے مستقل

طور پر بلیک بورڈ پر باقی رکھا جاتا تھا تاکہ مترجمین کی نظر میں رہے۔ حیات اللہ صاحب عام طور پر مختصر ایڈیٹوریل لکھتے تھے لیکن ایسی مثالیں بھی ہیں کہ بعض اوقات انھوں نے قسط وار ایڈیٹوریل لکھے ہیں۔ اس اخبار نے کافی لمبی عمر پائی، اس کے بعد عشرت علی صدیقی اور عثمان غنی نے اس روایت کو مزید استحکام پہنچایا۔ افسوس کہ عمر طبعی کو پہنچنے سے پہلے ہی اس مثالی روزنامے نے دم توڑ دیا۔

حیات اللہ صاحب کے افسانوں کا آخری مجموعہ جو میری نظر سے گزرا "شکستہ کنگورے" تھا جس کے افسانوں "شکر گزار آنکھیں" اور "آخری شام" کو ترقی پسند حلقوں میں بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا اور علی عباس حسینی کے بعد مرکز لکھنؤ کے سب سے بڑے افسانہ نگار وہی تھے۔ ان کے افسانوں کا بے ساختہ پن، زبان کی شستگی اور انسانی فطرت کی مخلصانہ عکاسی کے لیے یاد رکھا جائے گا۔

ان کا سب سے بڑا کارنامہ تحریک آزادی سے متعلق پانچ جلدوں پر مشتمل ناول ہے جو "لہو کے پھول" کے نام سے شائع ہوا۔ اگرچہ حیات اللہ خود تحریک آزادی میں عملی طور سے شریک نہ ہو سکے، اس کا سبب انھوں نے اپنی مسلسل بیماریوں کو بتایا ہے۔ لیکن وہ اس تحریک سے فطری اور نظری طور پر ہمیشہ وابستہ رہے اور قید و زنداں سے باہر رہ کر بھی انھوں نے عملی طور پر تحریک میں مدد دی۔ کچھ دن گاندھی جی کے سیوا گرام میں آشرم کی زندگی کا بھی تجربہ حاصل کیا۔

اردو کی تحریک سے انھوں نے عملی جد و جہد ہمیشہ جاری رکھی اور اس زبان کی سرکاری حیثیت کو منوانے کے لیے بائیس لاکھ دستخط جمع کر کے میمورنڈم کی شکل میں صدر جمہوریہ ہند کو پیش کیے۔ انجمن ترقی اردو کے بھی رکن رہے لیکن طریقۂ کار سے اختلافات کی وجہ سے وہ مرکزی انجمن سے الگ ہو گئے اور یو۔ پی کی ایک الگ شاخ قائم کر دی۔ ادارے کی کل ہند جماعت نے اسے منظور نہیں کیا اور ادارے کے ماتحت ایک نئی صوبائی شاخ قائم کی جو چودھری شرف الدین صاحب کی رہنمائی میں نہایت سرگرمی سے مصروف عمل ہے۔ ضلعوں میں بھی شاخیں قائم کی گئی

ہیں اور ضلعوں، قصبوں اور گاؤں میں اردو کی ابتدائی تعلیمی مہم بھی جاری ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کو اور جاندار بنایا جائے۔ اس تحریک کا ایک خوش گوار پہلو یہ ہے کہ اس میں ہمارے نوجوان ہندو اور سکھ طلبا بھی شریک ہو رہے ہیں اور اردو کی سیکولر حیثیت کو فروغ مل رہا ہے۔

حیات اللہ صاحب کی جدوجہد میں ان کی رفیقہ حیات سلطانہ حیات مرحومہ کا بھی فعال کردار رہا ہے، افسوس یہ دونوں بہت جلد ہم سے جُدا ہو گئے۔

رہے نام اللہ کا

عشرت علی صدّیقی

حیات اللہ صاحب اور اردو صحافت

حیات اللہ انصاری صاحب جب ۱۹۳۷ء میں صحافت کے میدان میں اُترے اس سے پہلے وہ افسانوی ادب میں خاصی پیش رفت کر چکے تھے۔ پہلے ہفتہ وار 'ہندستان' میں اور پھر روزنامہ قومی آواز میں ان کا میرا ساتھ کوئی ۳۲ برس رہا۔ پہلے پانچ برس ہندستان میں پھر تقریباً ۲۷ برس قومی آواز میں۔

دسمبر ۱۹۴۲ء سے دسمبر ۱۹۴۵ء تک "ہندستان چھوڑو" یعنی Quit India تحریک کے دوران 'ہندستان' بند رہا اور مجھے قاضی عبدالغفار نے روزنامہ 'پیام' میں بُلا لیا۔ دسمبر ۴۵ء میں جب قومی آواز جاری ہوا تو حیات اللہ صاحب نے مجھے لکھنؤ طلب کر لیا۔ میں پہلے ان کا نائب پھر جانشین بنا اور ۱۹۹۲ء تک اس اخبار کی خدمت کرتا رہا۔

جیسا کہ عرض کیا گیا حیات اللہ صاحب صحافی سے پہلے افسانہ نگار کی حیثیت سے شہرت پا چکے تھے، ان کے افسانے آخری کوشش، ہاں مت وغیرہ آج تک معیاری بنے ہوئے ہیں اور ان کا ضخیم ناول لہو کے پھول' اردو ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ناول انھوں نے قومی آواز کی ایڈیٹری کے زمانے میں لکھا۔ ناقدوں نے اس کی تعریف و تحسین کی ہے اور اس کے لیے حیات اللہ صاحب کو اعزاز و اکرام ملے ہیں۔ وہ ہر اعتبار سے اس کے مستحق ہیں۔ ان کی افسانہ نگاری

اور ناول نگاری پر تبصرہ کرنا اور اس کا جائزہ لینا میرے بس سے باہر ہے۔
ایسا جائزہ اس سمینار کے موضوع سے بھی الگ ہے۔ لیکن 'لہو کے پھول'
میں مجھے صحافت کی خوشبو محسوس ہوئی۔ اس میں عصری سماج اور سیاست کی
تفصیلی تصویر پیش کی گئی ہے اور اس تصویر کشی میں مجھے صحافتی انداز کی جھلک
دکھائی دی۔ اس ناول میں کانگریس، مسلم لیگ، کمیونسٹ پارٹی، کسانوں اور مزدوروں
کی ٹریڈ یونین تحریک اور ان تحریکوں میں حصہ لینے والوں کی جاگتی بولتی تصویریں
نظر آتی ہیں۔ اسی طرح حیات اللہ صاحب کی صحافت میں فکشن کا انداز نظر
آتا ہے۔ ان کے ناول کی طرح ان کے صحافتی تبصروں میں بھی مسئلوں کو
ایک بڑے کینوس پر وسیع تر پس منظر کے ساتھ اور مثالوں کے ذریعے پھیلا کر
پیش کیا جاتا تھا جیسے ملائم حلوہ سینی میں پھیلا دیا جاتا ہے یا ہرا چارہ مشین
سے کاٹ کر جانوروں کو کھلایا جاتا ہے۔
وہ دُھن کے پکے تو ہیں ہی اپنے عقیدوں میں بھی پختہ ہیں۔ اور یہ
بات میں مذہبی عقیدوں کے متعلق نہیں بلکہ سیاسی اور سماجی مسلک کے تعلق
سے عرض کر رہا ہوں۔ ان کی قوم پروری، قوم پرستی کی حد کو چھوتی دکھائی دیتی
ہے۔ وہ نہ ادب برائے ادب کے قائل ہیں، نہ صحافت برائے صحافت کے۔
۱۹۴۲ء کی "ہندستان چھوڑو" تحریک کے دوران جب بہن امۃ السلام نے جو
گاندھی جی کی چیلی بلکہ منھ بولی بیٹی تھیں ہم لوگوں کو بمبئی بلا کر کہا کہ گاندھی جی
نے جیل جانے سے پہلے خواہش ظاہر کی تھی کہ اردو میں ایک غیر سیاسی اخبار
نکالا جائے تو ہم لوگوں نے کہا کہ گاندھی خود سیاسی آدمی ہیں، شاید بہن ان کا
مفہوم پوری طرح سمجھ نہیں پائیں اور امن و اتحاد کی باتیں سیاست سے
بالکل الگ نہیں رکھی جا سکتیں۔ بہن ہم لوگوں کو بامبے کرانیکل کے ایڈیٹر
سید عبداللہ بریلوی کے پاس لے گئیں۔ لیکن انھوں نے بہن کو سمجھا دیا کہ
جیسا اخبار وہ چاہتی ہیں ویسا اخبار ہم لوگ نہیں نکال سکیں گے۔ دوسروں کی

مدد سے اپنی پسند کا اخبار نکالا مگر وہ دو چار ہی ہفتے چل سکا۔

ہفتہ وار 'ہندستان' جب نکلا اس وقت مسلم لیگ کی تحریک جو بعد میں تقسیم ملک کی تحریک بن گئی نئی کروٹ لے رہی تھی۔ یہ اخبار اس تحریک کی سرگرم مخالفت کر رہا تھا۔ اس اخبار میں اطہر رشید کا لکھا ہوا ایک افسانہ شائع ہوا جس میں مسلم لیگ کے اجلاس پر جو لکھنؤ کے دیا ندھان پارک (لال باغ) میں ہوا تھا تیکھے انداز میں طنز کیا گیا تھا۔ اس افسانے کی اشاعت سے مسلم لیگ سے تعلق رکھنے والے عوام سے زیادہ خواص برافروختہ ہو گئے۔ ہفتہ وار ہندستان اور اس کی طرح روزنامہ قومی آواز بھی ہر قسم کی فرقہ پرستی سے خواہ وہ مسلم فرقہ پرستی ہو یا ہندو فرقہ پرستی، سے لڑتا رہا۔ ان اخباروں کے زیادہ تر پڑھنے والے مسلمان تھے۔ ملکی حالات، سیاست کاروں کی غرضوں اور غلطیوں اور بدیسی حکمرانوں کی براہ راست اور بالواسطہ ریشہ دوانیوں کی وجہ سے تقسیم کی تحریک آگے بڑھ رہی تھی اور اس میں مذہب کو ایک محرک کی طرح استعمال کیا جا رہا تھا۔ اس لیے ان دونوں اخباروں نے مسلم فرقہ پرستی کو خاص طور سے نشانہ بنایا۔

حیات اللہ صاحب نے مسلم سیاست کے مطالعے اور تجزیے میں ایک خاص قسم کی مہارت حاصل کر لی۔ سیاست میں مذہب کا بے جا استعمال دیکھ کر وہ ان مذہبی رہنماؤں کو جو کانگریس کی تحریک سے اتفاق نہیں کرتے تھے یا اس سے الگ رہتے تھے شدت پسندانہ شک کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ اس شک اور مخالفت کا اظہار انھوں نے کئی کئی قسطوں میں نکلنے والے اداریوں میں کیا۔ ڈاکٹر فریدی، مولانا عبدالماجد دریا بادی، سید سلیمان ندوی اور مولانا ابوالحسن علی ندوی حیات اللہ صاحب کے اداریوں اور تنقیدی تحریروں کے مرغوب اور مسلسل موضوع رہے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم فرنگی محل میں حاصل کی تھی اور یہ تعلیم مذہبی نوعیت کی تھی، بعد میں وہ عصری تعلیم کے لیے علی گڑھ

مسلم یونی ورسٹی گئے۔ جہاں ترقی پسند کہلائے جانے والے نوجوانوں اور ادیبوں سے ان کے روابط قائم ہوئے۔ چونکہ ترقی پسند ادب کی تحریک پر کمیونسٹوں کا غلبہ تھا اور حیات اللہ صاحب کانگریسی تھے اس لئے ترقی پسند تحریک میں انھیں وہ جگہ نہیں مل سکی جس کا وہ اپنے کو حقدار سمجھتے تھے۔ اس محرومی کی کسک ان کی ادبی اور صحافتی دونوں طرح کی تحریروں میں نظر آتی ہے۔ وہ مذہب کے مخالف تو نہیں بنے مگر مذہبیت کی اور خاص طور پر سیاست اور مذہبیت کے اختلاط اور امتزاج کی وہ لگاتار مخالفت کرتے رہے۔ فرنگی محل کے مدرسے میں انھوں نے جو منطق پڑھی تھی اس کی مدد سے انھوں نے ہندی کی چندی نکالنے میں کمال حاصل کر لیا تھا۔ اس کمال سے کام لے کر وہ اپنے دعوے کو تقویت پہنچانے اور اپنے مخالفوں کی پوزیشن کو مضحکہ خیز ثابت کرنے میں مدد لیتے تھے۔ ایک بار انھوں نے اعداد شمار کی مدد سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ پرانے زمانے کے مقابلے میں مہنگائی اور اس سے پیدا ہونے والی پریشانی بڑھی نہیں بلکہ گھٹی ہے۔

قومی آواز میں حیات اللہ صاحب کی زیادہ تر تحریریں مسلم سیاست اور اس سے متعلق موضوعات کے بارے میں ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے اردو کی تعلیم کو فروغ دینے کے لیے جو قاعدہ لکھا اسے مقبول بنانے اور اردو کو اتر پردیش کی دوسری سرکاری زبان بنوانے کے لیے جو دستخطی مہم چلائی اسے آگے بڑھانے میں بھی ان کی زیر قیادت قومی آواز نے نمایاں حصہ لیا۔ اس مہم کے سلسلے میں انھوں نے کل ہند انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری قاضی عبدالغفار تک سے ٹکر لی اور انھیں اردو کے مفاد کا مخالف بتایا۔ اس لیے کہ بہ قول قاضی صاحب انجمن اس مہم کے لیے مطلوبہ فنڈ نہیں فراہم کر رہی تھی اور مالیات پر اپنا کنٹرول قائم رکھنا چاہتی تھی لیکن قاضی صاحب کے انتقال پر حیات اللہ صاحب نے جو اداریہ لکھا اس میں مہم کو منزل مقصود تک پہنچانے

میں قاضی صاحب کے تعاون کا دل کھول اعتراف کیا۔

اردو اور مسلم سیاست سے متعلق مسائل پر حیات اللہ صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اس کا مطالعہ ان مسائل کو سمجھنے اور ان کے بعض پہلوؤں کا تجزیہ کرنے کے لیے مفید بلکہ ضروری ہے۔ یہ مسائل برابر اُلجھتے جا رہے تھے، شاید اسی لیے حیات اللہ صاحب اپنی بات بار بار دوہرا تے تھے اور غیر سیاسی مسلم تحریکوں اور لیڈروں کی بنیاد اور باتوں کو مشتبہ قرار دیتے تھے۔ کچھ تو ان مسائل پر توجہ مرکوز رکھنے کی وجہ سے اور کچھ یوپی لیجسلیٹو کونسل اور راجیہ سبھا میں اپنی مصروفیت اور دوسری مشغولیتوں کی وجہ سے حیات اللہ صاحب کو دوسرے مسئلوں کا مطالعہ کرنے اور ان پر تبصرہ کرنے کے لیے بہت کم وقت ملتا تھا۔ غالباً وہ ان دوسرے مسئلوں کو ثانوی درجے کی بلکہ اس سے بھی کم اہمیت دیتے تھے۔ اس طرح اسٹاف کے دوسرے ارکان کو ان مسئلوں کا مطالعہ کرنے اور ان پر لکھنے کی تحریک ملتی تھی۔

موضوعات کے معاملے میں اپنی مرغوبات اور اپنے اختصاص پر زیادہ توجہ دینے کے باوجود حیات اللہ صاحب نے صحافت کے میدان میں بعض نئے راستے اور طریقے دریافت اور ایجاد کیے۔ ان کی ندرت پسند طبیعت کا ایک نمونہ قومی آواز کی لوح ہے، جسے بنانے میں انھوں نے نگاہ کے زاویوں اور حروف کے توازن اور تناسب کا اندازہ لگانے میں آرٹ اور سائنس دونوں سے مدد لی۔ اسی طرح انھوں نے صحافت میں بعض سادہ اور عام فہم اصطلاحات رائج کیں اور اردو املا میں کئی اصلاحات کیں۔ ہندوستان کا 'و' تو انجمن ترقی اردو نے حذف کیا مگر 'بین الاقوامی' کو 'بین اقوامی' حیات اللہ صاحب نے بنایا۔ انھوں نے اخباری کتابت میں نستعلیق اور نسخ کے علاوہ دونوں کے بیچ کے خط اور گھسیٹ کو رائج کیا۔ خبروں کی ترتیب، سُرخیوں کے الفاظ کی تعداد اور صفحے کی سجاوٹ میں ڈرائنگ اور ڈیزائن کے

استعمال نے خبروں کی اہمیت کو بڑھانے گھٹانے کے علاوہ اخبار کو دیدہ زیب بھی بنایا۔ ان مقاصد کے تحت قومی آواز نے خبروں کے لئے کئی نمونوں کے حلقے رائج کئے، مثلاً ایک طرف حاشیے والا حلقہ، دوطرفہ حاشیہ والا حلقہ، تیر مارکہ حلقہ اور چوپنج مارکہ حلقہ۔ سجاوٹوں کے لیے ڈرائنگ سے واقف ایک صاحب کو جز وقتی ملازمت دی گئی۔ اسٹائل شیٹ تیار ہوئی، نمونے کے خط اور ڈیزائن چھاپے گئے لیکن دھیرے دھیرے انوکھی چیزیں رواجی بن گئیں۔ ان سے اسٹاف کی دلچسپی کم ہوگئی۔ حیات اللہ صاحب کی مصروفیتوں اور دلچسپیوں کا تنوع بڑھ گیا۔ ان کی ترجیحات بھی بدل گئیں۔ ان کی راجیہ سبھا کی ممبری کی مدت ختم ہونے پر غیر صحافی سرگرمیاں کم ہوسکتی تھیں اور ممکن تھا کہ صحافی سرگرمیوں کے لیے مزید وقت نکل آتا لیکن اسی اثنا میں ان کے ریٹائرمنٹ کا وقت آگیا۔

اگر حیات اللہ صاحب کی توجہ اور دلچسپی صحافت اور افسانہ نگاری و ناول نگاری اور قانون ساز مجالس کی رکنیت اور سیاست پر تقسیم نہ ہو جاتی تو وہ جس کام کو اپنے لیے چنتے اس میں اور بھی بلند مقام حاصل کر سکتے تھے۔ مجالس قانون ساز کی رکنیت کے ساتھ تو دوسرے جائز ناجائز کام جاری رہ سکتے ہیں مگر صحافت خاص کر روزناموں کی صحافت میں اور دوسرے پیشوں کے درمیان رقابت پائی جاتی ہے۔ یہ صحافت خاص طور سے اردو روزنامہ والی صحافت جز وقتی نہیں کل وقتی کام ہے۔ یہ پتہ ماری کا کام ہے۔ یہ کام ایمان داری اور معیار کی پابندی سے کیا جائے تو معاوضہ بہت کم ملتا ہے۔ اسی لیے صحافی مختلف میدانوں میں طبع آزمائی اور قسمت آزمائی کے لیے مجبور ہو جاتا ہے اور صحافت کا پورا حق ادا نہیں کر پاتا۔

ان تمام دشواریوں اور مجبوریوں کے باوجود حیات اللہ صاحب نے اردو صحافت میں ایک نئی شاہراہ اور کئی نئے ضمنی راستے تعمیر کیے۔ ان کی صحافتی زندگی کے تفصیلی مطالعہ کی ضرورت ہے۔ یہاں میں صرف ایک سرسری خاکہ پیش

کر سکا ہوں، بعض باتیں اشاروں میں اور بعض بین السطور میں کہی گئی ہے۔
اس خاکے میں رنگ بھرنے کے لیے ہفتہ وار ہندستان اور روزنامہ قومی آواز سے مدد مل سکتی ہے۔ جن لوگوں نے دونوں اخباروں میں حیات اللہ صاحب کے ساتھ ان کے ریٹائرمنٹ اور اس کے بعد تک کام کیا اور ابھی تک صحافت کے میدان میں کچھ کر رہے ہیں ان میں اب اکیلا یہ عاصی اور عاجز زندہ ہے۔
ان اخباروں کے پورے فائل بھی نایاب ہیں۔ ہندستان کا ایک فائل میرے پاس تھا اس کو ذبح کرکے اس کے خون سے قومی آواز کے بدن پر جب وہ بچہ تھا مالش کر دی گئی اور قومی آواز کے پرچے اخبار کے انتظام کاروں نے کباڑ کی طرح تیسری منزل کے ایک کمرے میں بھروا دیے۔ اس کباڑ میں حیات اللہ صاحب کے صحافتی نوادرات دفن ہیں اور اس دردناک داستان میں :

پکھ خونِ تمنا بھی ہے شامل میرا

منیر مسعود

لہو کے پھول

حیات اللہ انصاری اردو کے ان معدودے چند ادیبوں میں ہیں جن کو مختصر افسانے کے فن پر کامل عبور حاصل ہے۔ وہ سیدھی، بہ ظاہر سپاٹ اور غیر شاعرانہ نثر اور غیر جذباتی لہجے میں قصہ بیان کرتے ہیں۔ غیر ضروری تفصیلات سے دامن بچاتے ہیں، یا شاید تفصیلات کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ وہ ضروری معلوم ہونے لگتی ہیں۔ اُن کی یہ مہارت "لہو کے پھول" میں بھی نمایاں ہے جو اردو کے طویل ترین ناولوں میں ہونے کے باوجود طول کلامی کے عیب سے حیرت خیز طور پر پاک ہے اور ڈھائی ہزار سے زیادہ صفحوں پر پھیل کر بھی اختصار اور کفایت الفاظ ہی کے نمونے زیادہ پیش کرتا ہے۔ کردار نگاری، واقعہ نگاری اور منظر نگاری میں حیات اللہ انصاری نے اطناب کے بجائے ایجاز سے کام لیا ہے اور ان میں ناول سے زیادہ مختصر افسانے کا انداز اختیار کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ناول کے متعدد باب ایسے ہیں جو مختصر افسانے کی حیثیت سے پڑھے جا سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر جب ناول کا گیارہواں باب "پرانے کوہ و صحرا" ایک رسالے میں الگ سے چھپا تو اس نے کسی عمدہ افسانے کی طرح پڑھنے والوں کو متاثر کیا۔ لیکن ظاہر ہے ناول پر افسانے کا گمان ہونا کوئی اچھی بات نہیں ہے اور "لہو کے پھول" پر افسانوں کے مجموعے کا گمان ہونا بھی نہیں چاہیے، اس لیے کہ یہاں ایک باب میں سامنے آنے والے کردار اور واقعات بعد کے ابواب میں وقت کے اگلے قدم کے ساتھ بڑھ کر سامنے آتے اور ناول کی طویل و عریض بافت کا جز بنتے ہیں۔ شاید اسی لیے "لہو کے پھول"

ادبستان، دین دیال روڈ، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۳

شطرنج کی ایک بہت بڑی بساط کی طرح نظر آتا ہے جس پر مصنف ایک ماہر کھلاڑی کی طرح بہت سوچ سمجھ کر اپنے مہروں کو باری باری ایک ایک دو دو خانے آگے بڑھاتا ہوا بساط کے آخر تک لے جاتا ہے۔

اپنے کرداروں کی نفسیاتی تبدیلیوں اور حالات کے تدریجی تغیر کی رفتار کو حیات اللہ انصاری نے بڑی مضبوطی کے ساتھ اپنی گرفت میں رکھا ہے اور کم الفاظ استعمال کرنے کے باوجود اس رفتار کو غیر فطری طور پر تیز یا اپنے بیان کو تشنگی محسوس کرانے کی حد تک سرسری نہیں ہونے دیا ہے۔ مثلاً رجبی کا ایک سادہ لوح فریب خوردہ دیہاتی عورت سے بدل کر چالاک اور فریب کار بیسوا بن جانا، یا راحت رسول کے گھرانے کا خوش حالی سے خستہ حالی کی اس منزل تک پہنچ جانا جہاں دو وقت کے کھانے کا آسرا بھی ٹوٹنے لگے، یہ وقوعے ایسے ہیں جن کو موضوع بنا کر بہ آسانی ایک مکمل ناول تیار کیا جا سکتا ہے لیکن حیات اللہ انصاری نے ان تبدیلیوں کی رفتار کو ناول کی عام سبک اور ہموار رفتار کے مطابق رکھا ہے۔

''لہو کے پھول'' مخصوص سیاسی اور سماجی نظریات کے زیر اثر لکھا گیا ہے، لیکن محتاط مصنف نے اپنے نظریات کے اظہار میں خطابت کا بازار گرم یا وعظ و پند کے دفتر کھولنے کے بجائے واقعات کی فن کارانہ ترتیب اور کرداروں کے مناسب انتخاب اور ان کی نفسیات کی تصویر کشی سے کام لیا ہے۔ اس طرح ایک خطرناک جادے پر چلنے کے باوجود حیات اللہ انصاری نے ''لہو کے پھول'' کو محض ایک تبلیغی کوشش ہو کر رہ جانے سے بچا لیا ہے اور ادب کا قاری اسے ایک پر قوت اور بصیرت افروز ناول کے طور پر پڑھ سکتا ہے۔

کم و بیش پورے ناول میں حیات اللہ انصاری سرد مہری کی حد تک غیر جذباتی رہے ہیں۔ کسی جوش یا ہیجان یا غصے یا غم کا اظہار کیے بغیر وہ اپنے مخصوص ٹھہرے ہوئے اور اشتعال ناپذیر لہجے میں قصہ بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن ان کی غیر جذباتیت مشینی یا اخباری نہیں ہے۔ وہ استعارہ و تشبیہ کو بڑی بے ساختگی کے ساتھ صرف کر کے

اپنے بیان میں تخلیقی شان پیدا کرتے ہیں۔ اس کی بہت اچھی مثالیں وہ ردِّ عمل ہیں جو مولانا یاور کی دست درازی سے کمسن فریدہ پر اور اندھے فقیر بھولا کے بچھڑے معشوق میداجان کی واویلا سے راحت رسول پر دکھائے گئے ہیں۔ دونوں منظر دیکھیے:

"یاور صاحب بہت لمبے تڑنگے، بڑی بڑی مونچھوں اور خوفناک آنکھوں والے ابّا تھے۔ انھوں نے فریدہ کی بات بہت باریک نظروں سے سُنی، پھر بولے:

"جوڑوں کی سِلائی اور دو روپے۔ پہلی بات تو شگفتہ کی امّی کے آنے پر ہوگی، لیکن دوسری ابھی ہو سکتی ہے۔ اِدھر آؤ، میں روپے دے دوں۔"

وہ فریدہ کو ذرا آڑ میں لے گئے اور پھر صندوقچہ کھولتے ہوئے پوچھنے لگے:

"تم نے اپنی گڑیا کی شادی شگفتہ کے گُڈّے سے کی تھی؟"

"جی ہاں۔"

یاور بیگ ہنسے: "معلوم ہے کہ شادی ہو جانے کے بعد کیا ہوتا ہے؟"

فریدہ ذرا جھینپ کر بولی: "گڑیا گڈّے کے ساتھ چلی جاتی ہے۔"

"بس؟ اتنا ہی نہیں، کچھ اور بھی ہوتا ہے۔ اِدھر آؤ تو بتلاؤں۔"

فریدہ گھبرائی ہوئی نظروں سے یاور بیگ کو دیکھتی ہوئی اُس کے قریب چلی گئی۔ یاور نے ایک ہاتھ فریدہ کی پیٹھ پر رکھا، دوسرا اُس کے سینے پر، اور پھر فریدہ کے ہونٹوں کا بدتمیزی سے کرارا بوسہ لے لیا، ساتھ ساتھ سینے پر چٹکی بھی۔

فریدہ نے بے اختیار دونوں ہاتھوں سے یاور کی مونچھیں نوچ لیں اور زور کی چیخ ماری اور پھر دروازے کی طرف بھاگی۔

شگفتہ چلّانے لگی "کیا ہوا، کیا ہوا؟" لیکن فریدہ بھاگی چلی گئی۔ اس کا بدن غصّے، شرم، غیرت اور کوفت سے جُھلسا جا رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے سے درجنوں پردے اُٹھ گئے تھے اور زندگی کی حقیقتیں عریاں ہو کر سامنے آگئی تھیں، لیکن ان حقیقتوں میں ذرا بھی جو لذّت ہو۔ وہ سب بھیانک اور بے حد بھیانک تھیں۔ فریدہ کا بچپن اس ایک دھکّے سے لالٹین کی چمنی کی طرح ٹوٹ گیا تھا اور اندر سے دھواں اور لَو دیتی ہوئی جوانی

بدمزگی لے کر نمودار ہو گئی تھی۔"

"اچانک میدا ہاتھ جوڑ کر راحت کے قدموں پر گر پڑا اور بچوں کی طرح بھوں بھوں رونے لگا۔ اُس کے حلق سے کچھ ایسی آواز نکل رہی تھی جیسے کسی پلّے کے منھ سے نکلتی ہے اگر اُسے زور سے کوئی مار بیٹھے ــــ چند منٹ بعد آواز پر قابو پاکر اس نے کہا:

"حجور، حجور، مجھ سے سب نفرت کرتے ہیں ۔ ۔ ۔ مجھے جو مارا جاتا ہے اس سے اتنی تکلیف نہیں ہوتی ہے جتنی اس سے کہ میرے ناخون پتھر پر گھسے جاتے ہیں، میری پیٹھ پر برف کی سِل باندھ دی جاتی ہے۔ بھگوان کے لیے مجھے بچالو۔ کچھ نہ کرسکو تو مجھے مار کر ختم ہی کر دو۔ تم ہی میرے بھگوان ہو۔"

راحت کو روتا ہوا اور گڑگڑاتا ہوا بدصورت میدا مُردہ چھچھوندر اور کچلے ہوئے کیچوے سے بھی زیادہ گھنونا اور نفرت انگیز محسوس ہونے لگا۔ اس نے اپنے اوپر بہت جبر کر کے اتنی دیر اس سے گفتگو کی تھی۔ اب وہ ناقابلِ برداشت ہو گیا تھا، اس لیے بلا کچھ کہے سنے راحت میدا کو روتا اور سسکیاں لیتا ہوا چھوڑ کر باہر چلا آیا۔"

کرداروں کی کثرتِ تعداد اور تنوّع کے لحاظ سے بھی "لہو کے پھول" اردو کا منفرد ناول ہے۔ اس میں ہندوستان، خصوصاً یوپی، کے قریب قریب ہر طبقے کی نمائندگی کرنے والے کردار موجود ہیں۔ یہ بھک منگوں سے لے کر والیانِ ریاست تک ہیں۔ ان سب کا کسی نہ کسی صورت میں ہندوستان کی تحریکِ آزادی سے ربط ہے۔ ان کرداروں کی پیش کش میں حیات اللہ انصاری نے مختلف طریقے اختیار کیے ہیں، مثلاً کہیں وہ کرداروں کی ظاہری ہیئت دکھا کر ان کے طرزِ زندگی کا نقشہ کھینچ دیتے ہیں اور کہیں ان کی بعض اداؤں کے بیان سے اُن کی اُفتادِ طبع اور ذہنی سطح وغیرہ کا اندازہ کرا دیتے ہیں ــــ یہ نمونے دیکھیے:

"چار پانچ فقیر، جو تندرست اور صحت مند تھے، آگے بڑھ کر راحت

سے باتیں کر رہے تھے۔ اُن کے پیچھے عورتوں، بچّوں، بوڑھوں، بیماروں، اپاہجوں، اندھوں اور کوڑھیوں کی ایک بھیڑ اکٹھا تھی۔ جوئیں دار بالوں اور بہتی ناکوں والی جوان لڑکیاں، چُندھی آنکھوں اور پھٹے گالوں والے بلکتے ہوئے بچّے، کھانستے اور کراہتے ہوئے بوڑھے اور پھولی ہوئی سانسوں والے مریض؛ بدن پر کے گودڑ میلے، بال چکٹے اور آنکھیں اور ناکیں سنڈاس؛ اور دانت اور منہ آخور۔ ہر ہر چیز پر اور ہر ہر عضو پر میل ہی میل، گندگی ہی گندگی۔ اِن آدمیوں سے سڑاہند کے بھپکے نکل رہے تھے۔ راحت کو ان کے مقابل غلیظ سے لپی ہوئی کیچڑ صاف سُتھری معلوم ہونے لگی۔"

"ہز ہائی نس نواب صاحب فرّخ پور . . . ایک بھاری کوچ پر، جو پھولوں کے ہاروں اور گجروں سے لدی ہوئی تھی، توند کھولے بیٹھے ہوئے تھے۔ بجلی کا پنکھا بند کر دیا گیا تھا اور اس وقت چار ملازم ہاتھ کے بڑے پنکھے جھل رہے تھے، اور اِدھر اُدھر دو ملازم ہاتھوں میں ہار لیے کھڑے ہوئے تھے، اور جہاں کوچ کا کوئی ہار زیادہ مَسل جاتا اُسے فوراً بدل دیتے۔ نواب کے قدموں پر رنگین کُرتوں اور تہمتوں میں ملبوس دو چھوکرے نواب صاحب کے پیر مل رہے تھے۔ نواب صاحب کے سامنے وہسکی کا گلاس اور بہت سے پان رکھے ہوئے تھے۔ وہ وہسکی کا ایک گھونٹ پیتے، پان چباتے، چھوکروں کی طرف دیکھتے، پھر پاؤں ان کی تہمت کے اندر لے جا کر اِدھر اُدھر چبھو دیتے۔ چھوکرے اس پر ہنستے، بل کھاتے اور نواب صاحب کے قدموں سے لپٹ جاتے۔ پھر نواب صاحب اُگال دان کی طرف اشارہ کرتے جسے لیے ہوئے ایک ملازم کھڑا تھا۔ اُس میں منہ صاف کرتے۔ اُسی وقت ایک اور ملازم

لوٹا بڑھاتا اور دوسرا ملازم آفتابہ۔ نواب صاحب کُلّی کرتے، پھر وِسکی کا ایک اور گھونٹ پیتے، پھر پان چباتے، پھر چھوکروں کو پاؤں کے انگوٹھوں سے چھیڑتے، پھر اگالدان کی طرف اشارہ کرتے۔"

"ہز ہائی نس نواب بڑھن نگر بہت رنگین اور چمکیلے کپڑے پہنے، لپ اسٹک، پوڈر اور غازہ لگائے بیٹھے تھے۔ اُن کے گھونگھریالے پٹے ان کے گالوں کو چوم رہے تھے۔ اُن کے پیچھے ان کا انگریز ہیر ڈریسر کھڑا تھا اور اس کے برابر ان کے مصاحب تھے۔ جب غزلیں ختم ہوئیں تو نواب بڑھن نگر نے بہت ادا سے پوچھا:

"آپ لوگ کچھ کمال بھی دیکھیں گے؟"

سب نے کہا، "ہاں ہاں"۔ نواب صاحب نے اپنے مصاحبوں کو اشارہ کیا۔ اُن میں سے ایک منہ سے طبلہ بجانے لگا، دوسرا ناک سے سارنگی، اور تیسرے نے گانا شروع کیا۔ وہ مردانی آواز بھی نکالتا اور زنانی بھی۔ اور دونوں آوازوں میں ایسی ایسی گٹکری اور تانیں لگائیں کہ محفل پھڑک گئی۔ ہز ہائی نس نواب بڑھن نگر بیچ بیچ میں گانے والے کو فنّی اشارے بھی دیتے جاتے تھے۔"

"لہو کے پھول" کا دائرہ اتنا وسیع اور مناظر اتنے مختلف النوع ہیں کہ اردو کے ممتاز ناولوں میں سے بیشتر کا دائرہ اس کے اندر سمٹ جاتا ہے اور یہ ناول سمندر کی طرح بہت سے دریاؤں کو اپنے میں ضم کر لیتا ہے۔ اس خصوص میں "لہو کے پھول" کے ساتھ عبداللہ حسین کے ناول "اُداس نسلیں" کا نام ذہن میں آنا فطری بات ہے۔ دونوں ناولوں میں واقعات ہندوستان پر برطانوی تسلط سے شروع ہو کر سیاسی بیداری کے دھاروں، قومی اور عوامی تحریکوں کی ہلچل اور فسادات کی آگ سے

گذرتے ہوئے آزادی اور تقسیمِ ملک کے کچھ بعد تک کے زمانے کو محیط ہیں اور دونوں ناولوں میں ہندوستان ایک متلاطم سمندر ہے۔ "اُداس نسلیں" کا مرکزی کردار نعیم ہے جس کے گرد یہ سارا زمانہ اور اس کے واقعات گھومتے ہیں۔ نعیم پیش منظر پر حاوی ہے اور سمندر اس کی پُشت پر موجیں مارتا رہتا ہے۔ نعیم کا کردار اپنے خارجی ماحول پر اثر انداز نہیں ہوتا بلکہ خارجی ماحول اس پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس طرح "اداس نسلیں" انسان کے ظاہر سے زیادہ اس کے باطن کی کہانی ہے۔ ناول میں بنیادی حیثیت اسی مرکزی کردار کی ہے اور واقعات محض پس منظر کا کام کرتے ہیں جنھیں تبدیل کر دیا جائے تو بھی ناول کی بنیادی ماہیت میں تبدیلی محسوس نہیں ہوگی۔ "لہو کے پھول" اس حد تک "اُداس نسلیں" سے ضرور مماثل ہے کہ اس میں بھی واقعات برطانوی دورِ حکومت سے چل کر تقسیمِ ہند کے بعد تک جاتے ہیں۔ لیکن "لہو کے پھول" میں کوئی ایک مرکزی کردار نہیں ہے بلکہ مختلف طبقوں اور مختلف خیالات کی نمائندگی کرنے والے بہت سے کردار ہیں اور ناول میں بنیادی حیثیت ان کرداروں کی نہیں بلکہ انھیں پیش آنے والے واقعات کی ہے۔ یہ واقعات ان کرداروں کو متاثر بھی کرتے ہیں لیکن یہ کردار خود بھی ان واقعات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان واقعات نے ہندوستان ہی کی طرح اس ناول کو بھی ایک متلاطم سمندر بنا دیا ہے جس کے مدّوجزر میں مختلف کردار بار بار اُبھرتے اور سمندر میں نئی موجیں اُٹھا کر غائب ہوتے رہتے ہیں۔ پیش کش کے اس انداز نے ایک طرف "لہو کے پھول" کو واقعات کی محض باز آفرینی ہو کر رہ جانے سے بچا لیا ہے، دوسری طرف ادبی بیانیے کی حیثیت سے اسے بلند تر کر دیا ہے۔

یہ چند سطریں "لہو کے پھول" کے بارے میں کچھ فوری اور سرسری تاثرات کی حیثیت رکھتی ہیں اور ناول کے ساتھ قطعی انصاف نہیں کرتیں۔ حیات اللہ انصاری کا یہ کارنامہ دقیق مطالعے اور تفصیلی تجزیے کا مستحق ہے اور ہماری تنقید نے ابھی تک اس کا یہ حق پوری طرح ادا نہیں کیا ہے۔

ادریس دہلوی

حیات اللہ انصاری

میں اردو اکادمی کا ممنون ہوں کہ انھوں نے مجھے جناب حیات اللہ انصاری کی ہشت پہلو شخصیت کے بارے میں اظہار خیال کا موقع دیا۔ اس موقع پر مجھے وہ مشہور کہاوت یاد آتی ہے " چھوٹا منھ بڑی بات" ! میں عمر اور تجربے میں ان سے بہت چھوٹا ہوں اور ان کی ذات جامع کمالات ہے، اس کے مختلف رنگ ہیں، ہر رنگ دوسرے سے الگ۔ مگر ابھرا ہوا۔

صحافت، ادب، سیاست، اردو کے حقوق کے لئے جہاد اور اردو کی تعلیم کو آسان بنانے کے لئے اک نئے درسی نظام کی تخلیق۔ ان میں سے ہر شعبے میں ان کے کارنامے ان کی عظمت کی شہادت دیتے ہیں۔ چونکہ میرا تعلق صحافت سے ہے اس لئے میں اس شعبہ میں ان کی زندگی اور شخصیت کے بارے میں کچھ کہنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

" قومی آواز" سے پہلے جناب حیات اللہ انصاری نے ہفت روزہ " ہندوستان" ۱۹۳۷ء میں نکالا لیکن " قومی آواز" ان کی زندگی اور شخصیت کا ایک ابھرا ہوا نقش بن کر ۲۹ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو اردو داں طبقہ کے سامنے آیا اور اردو اخبار نویسی کی نصف صدی میں اس کی حیثیت ایک روشن چراغ کی رہی ہے۔

قومی آواز کے پہلے شمارے سے ہی یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کے پیچھے گہری فکر اور سنجیدگی ہے۔ اداریہ اپنی پیشانی پر ایک برمحل شعر کے ساتھ شائع ہوتا تھا۔ اداریہ کے علاوہ دنیا کا حال، مراسلات اور گلوریاں اس کے ممتاز کالم تھے۔ روز اوّل سے اس کا مزاحیہ کالم "گلوریاں" بے حد مقبول رہا ہے، جسے حیات اللہ انصاری صاحب لکھتے تھے۔ اخبار کا یہ انداز ایسا تھا جو اپنی افادیت اور مقبولیت کی وجہ سے آج بھی برقرار اور مقبول ہے۔ قومی آواز اپنے معاصر تمام اردو اخبارات سے کئی معاملوں میں منفرد اور ممتاز تھا۔ شکل و صورت، سائز، کاغذ، کتابت و طباعت، خبروں کی ترتیب، سرخیوں میں اختصار اور جامعیت وقار اور اشتعال انگیزی سے اجتناب، یہ اس نئے اخبار کی خصوصیات تھیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اسی کمپنی کے انگریزی اخبار نیشنل ہیرالڈ کا قومی آواز نہ صرف ہم پلّہ تھا بلکہ مقبولیت اور افادیت میں نیشنل ہیرالڈ سے ایک قدم آگے رہا اور آج بھی ہے۔

حیات اللہ انصاری صاحب نے جس کام کو ہاتھ میں لیا، اس میں مکمل انہماک اور یکسوئی کے ساتھ اپنے جوہر صرف کئے وہ اخبار کی انفرادیت کے لیے شب و روز سوچتے تھے۔ اس وقت عام طور سے اردو اخبارات میں طویل سُرخیوں کا رواج تھا، اشتعال انگیز تحریریں عام تھیں، وہ اس طرز صحافت سے بیزار تھے اور خبروں میں حقیقت نگاری کے بجائے شاعرانہ اندازان کو ناپسند تھا اس لیے "قومی آواز" کو انھوں نے ان قباحتوں سے پاک اور محفوظ رکھا۔

اداریہ تحریر کرنے کے بارے میں حیات اللہ انصاری صاحب کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ قاری کو حقائق اور دلائل سے قائل کرنا چاہیے اور اس کے دماغ کو اس طرح متاثر کرنا چاہیے کہ اداریہ پڑھنے کے بعد پڑھنے والا خود سوچنے اور سمجھنے کی راہ اختیار کرے۔ قومی آواز میں انھوں نے اس روش

کو برقرار رکھا اور اس کے ساتھ ساتھ آزادیٔ صحافت پر آنچ نہیں آنے دی‘ وہ کانگریس کے ہم خیال تھے لیکن جس مسئلے پر پارٹی کے اصول اور عمل میں کوئی بات ناقابل قبول نظر آئی‘ تنقید کے تیر و نشتر چلانے سے انھوں نے کبھی گریز نہیں کیا۔ خصوصاً اردو اور فسادات کے سلسلے میں وہ اپنی پارٹی پر تنقید کرنے سے کبھی پہلو تہی نہیں کرتے تھے۔

اخبار کی طباعت کے معاملے میں بھی انھوں نے متعدد تجربوں کی رہنمائی کی اور اُس وقت کی لیتھو طباعت سے بہتر نتائج حاصل کیے۔ اس وجہ سے طباعت کے لحاظ سے قومی آواز کو اپنے معاصرین پر سبقت حاصل تھی۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ قومی آواز [illegible]ی روزناموں کی روش کا پہلا اردو نمونہ تھا۔

۱۹۵۲ء میں جب انجمن ترقی اردو نے اتر پردیش میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنوانے کے لئے صدر جمہوریہ کو بیس لاکھ دستخطوں کے ساتھ ایک عرضداشت پیش کرنے کا فیصلہ کیا تو انھوں نے آگے بڑھ کر اس مہم میں نمایاں حصّہ لیا اور دن رات محنت کر کے اکیس لاکھ دستخط جمع کیے۔ اردو کے تحفّظ کے لیے انھوں نے صرف دستخطیں جمع کرنے پر قناعت نہیں کی بلکہ ایک اور بڑا قدم اٹھایا "دس دن میں اردو" ان کا ایسا کارنامہ ہے جو اردو پڑھنے پڑھانے کے لیے بنیادی کلیدی نظام کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ اپنی صحافت کو بھی اردو زبان کے تحفّظ اور دوام کا ایک وسیلہ مانتے تھے۔

۱۹۷۵ء میں کلکتہ میں منعقدہ اردو ایڈیٹرس کانفرس کے دوسرے سالانہ اجلاس میں انھوں نے جو صدارتی خطبہ پڑھا تھا، اس کا بڑا حصّہ ہندستان میں اردو زبان کے وجود اور اس کے فروغ کے لیے مخصوص تھا۔ اردو زبان کی ترقی کے بارے میں سنجیدہ افراد آج بھی اس سے استفادہ

کر سکتے ہیں۔

اردو زبان سے اِن کا تعلق صرف صحافت تک محدود نہیں۔افسانہ نگار، ناول نگار، معلّم، سیاست داں اور اردو کے حقوق کے محافظ کی حیثیت سے ان کی خدمات گراں قدر ہیں لیکن اردو اخبار نویسی کو انھوں نے جو تعمیری روش، معقولیت پسندی کے ساتھ آرائش اور سلیقے کا مزاج عطا کیا، وہ ایسی راہ ہے جس کو اختیار کرنے والے اردو صحافت کے ورثہ میں بیش قیمت اضافے کرتے رہیں گے۔

بقیہ صـ ۱۱ کا

اقبال، اعزاز ان کے لیے بہت چھوٹی چیز ہے، اس اعزاز سے جناب حیات اللہ صاحب کو نہیں اعزاز کو فخر ہونا چاہیے۔ انھوں نے کبھی کسی سے کچھ نہیں مانگا۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ اپنی بقیہ زندگی اسی شانِ استغنا سے گزار دیں۔ آمین۔۔

حسن کمال

حیات اللہ انصاری۔ صحافی، لیڈر، ادیب

جب ہندستان بلکہ برصغیر کی اردو صحافت کی تاریخ مرتب کی جائے گی تو حیات اللہ انصاری کا نام اس فہرست میں درج پایا جائے گا جس میں راجہ رام موہن رائے، دیوان سنگھ مفتون، خواجہ حسن نظامی اور ظفر اللہ خاں جیسے جیّد صحافیوں کے نام محفوظ ہیں۔ بلکہ میں تو ایک قدم آگے بڑھ کر یہ کہنے میں بھی تکلّف محسوس نہیں کرتا کہ حیات اللہ انصاری اس فہرست میں بھی ایک منفرد اور نمایاں حیثیت کے حقدار تسلیم کیے جائیں گے۔ کیوں کہ جن ناموں کا ابھی ذکر ہوا ہے، اُن کے اخبارات لفظ اخبار کے لغوی معنی یعنی 'خبروں کا مجموعہ' کا پورا احاطہ نہیں کرتے تھے۔ اُس وقت کے اخبار پر مدیر یا مالک کی شخصیت چھائی رہتی تھی اور اخبار سیاسی، معاشی، سماجی بلکہ ادبی اور تہذیبی مسائل پر اس کے مدیر کے ذاتی خیالات کے اظہار کا ذریعہ ہوا کرتے تھے۔

اخبارات نے اپنی موجودہ شکل تحریک آزادی کی شدّت اور اس کے بعد جنگ عظیم کے دوران اختیار کی اور رفتہ رفتہ اخبارات میں خبروں کی اہمیت مدیر کی ذات کی اہمیت سے زیادہ بڑھ گئی۔ اخبارات میں خبروں کی اہمیت بڑھنے کے سبب مدیر کے لئے خبروں کی بھیڑ کے درمیان سے اپنی شخصیت کو ابھارنا بڑا مشکل کام ہو گیا۔ اپنی ذات اور اپنے خیالات کے اظہار کے لئے مدیر کے پاس ایک اداریہ رہ گیا

اور اداریہ بھی بے دستخطی، یعنی جس کے آغاز یا اختتام پر ضروری نہیں کہ اس کے دستخط بھی ثبت ہوں۔

اگر ان حالات میں بھی حیات اللہ انصاری اور روزنامہ 'قومی آواز' ایک ہی چیز کے دو نام سمجھے جانے لگے تو اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ:

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اور یہ ہوا ہے، ہماری پوری نسل اس شاندار کارنامے کی شاہد رہی ہے۔ سنہ ۵۰ء اور سنہ ۶۰ء کی دہائیوں میں کم از کم اردو کی دنیا کی حد تک، قومی آواز ایک آدرش اخبار اور حیات اللہ انصاری ایک آدرش ایڈیٹر بتائے جاتے رہے ہیں۔ ہندستان سے لے کر پاکستان تک صحافیوں کی ایک پوری کھیپ یا تو ان کی ذاتی تربیت کے سائے میں پروان چڑھی ہے، یا ان کی مدیرانہ خصوصیات سے متاثر ہو کر آگے بڑھی ہے۔ میں بڑے فخر اور بڑی مسرت و سعادت کے ساتھ اپنا نام بھی اسی کھیپ میں شامل سمجھتا ہوں۔

حیات اللہ انصاری صاحب کی جوانی اور میرا بچپن، ہم عصر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بھلا ہو نا مرحوم کا کہ انھوں نے بچپن ہی میں اخبار پڑھنے کی ایسی عادت ڈالی، جس سے آج تک پیچھا نہیں چھٹا۔ وہ بھی صفحۂ اول سے صفحۂ آخر تک لیکن اس چیز نے یہ احسان کیا کہ مجھے اپنے بچپن ہی میں حیات اللہ انصاری صاحب کا نام بھی معلوم ہو گیا اور ان کی افادیت کا احساس بھی ہو گیا۔

میں نے حیات اللہ انصاری صاحب کو کئی روپ میں دیکھا ہے۔ میں جب ممتاز ہائر سکنڈری اسکول میں، جو اب خیر سے ڈگری کالج بن چکا ہے، ساتویں درجے کا طالب علم تھا تو ایک بار حیات اللہ انصاری اسکول کے کسی جلسے میں بطور مہمان شریک ہوئے۔ ان کا سفید براق کھدر کا لباس میرے لیے دلچسپی کا سامان پیدا کر رہا تھا، لیکن ان کے شانے سے لٹکا ہوا ریوالور مجھے خوف و حیرت کے ملے جلے احساس میں مبتلا

کر رہا تھا۔

میں نے اس سے پہلے کبھی ریوالور کو اتنے قریب سے نہیں دیکھا تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ صحافی کا سب سے بڑا ہتھیار اس کا قلم ہوا کرتا ہے، اس لئے ظاہر ہے اُن کے شانے سے لٹکا ہوا ریوالور میرے لئے بے انتہا حیران کُن ثابت ہو رہا تھا۔ مجھے بعد میں بتایا گیا کہ حیات اللہ انصاری صاحب مدیر روزنامہ قومی آواز ہونے کے علاوہ اُس وقت کی حکمراں سیاسی جماعت کانگریس کے ایک لیڈر بھی ہیں اور یہ ریوالور غالباً صحافی کی حفاظت کے لیے نہیں بلکہ ایک لیڈر کی حفاظت کے لیے لگایا گیا تھا۔ اس نکتے کا انکشاف تو آج جا کر ہوا کہ سیاسی لیڈر کو ہر دور میں عوام سے زیادہ اپنی حفاظت کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ ممکن ہے کہ حیات اللہ انصاری صاحب کے ریوالور کا مقصد کچھ اور رہا ہو اور وہ یقیناً بے حد صحت مند اور مثبت رہا ہوگا۔ میں تو صرف یہ عرض کر رہا تھا کہ لیڈروں کی مسلح حفاظت کا نظارہ ہم بچپن ہی میں کر چکے ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ عرض کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ حیات اللہ انصاری صاحب کو راجیہ سبھا کی ممبری اس ریوالور کی وجہ سے نہیں بلکہ سو فیصدی اپنی لیاقت اور صلاحیت کی وجہ سے دی گئی تھی۔

ایک منفرد اردو ادیب، افسانہ نگار اور ناول نگار اُن کی شخصیت کا تیسرا روپ تھا۔ ان کی سیاسی فکر سے اختلاف رکھنے والے بلکہ منحرف حضرات بھی ان کی ادبی حیثیت سے انکار نہیں کر سکے۔ ان کا افسانہ 'کنگورے' اردو افسانوں میں ایک نمایاں مقام حاصل کر چکا تھا۔ 'لہو کے پھول' جیسے ضخیم ناول نے بھی اردو ناول کی کم مایہ دنیا میں ایک ممتاز مقام حاصل کیا ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں لکھنؤ یونیورسٹی کا طالب علم تھا اور حضرت گنج کا 'کافی ہاؤس' ادیبوں اور شاعروں کے لیے مرجع خلق کی حیثیت رکھتا تھا، اس وقت لکھنؤ کا ادبی ماحول ایک عرصے کے بعد اپنے زرّیں دور سے گذر رہا تھا۔ شاعروں اور ادیبوں کی تین تین نسلیں ایک ساتھ موجود تھیں۔ ایک نسل رضیہ سجاد ظہیر،

منظر سلیم، رام لال، حسن شہیر اور عابد سہیل جیسے ادیبوں اور شاعروں پر مشتمل تھی۔ دوسری نسل میں عثمان غنی، ستیش بترا، بشیشر پردیپ، اقبال مجید، رتن سنگھ اور احمد جمال پاشا وغیرہ شامل تھے اور تیسری نسل ہم جیسے مبتدیوں پر مشتمل تھی۔ لیکن یہ تمام نسلیں جن کردار ساز اور ادب ساز نگاہوں کے نیچے پرورش پا رہی تھیں، وہ نگاہیں علی عباس حسینی، پروفیسر احتشام حسین اور بلاشبہ حیات اللہ انصاری صاحب کی تھیں۔ لکھنؤ میں ادیبوں کا ایسا اجتماع اس کے بعد پھر کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔

ہفتہ وار ادبی جلسے ہوتے تھے، جن میں کوئی ادیب اپنا تازہ افسانہ سناتا تھا اور کوئی شاعر اپنی نئی تخلیق اور اس کے بعد صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے کی تفسیر کھلتی تھی۔ اتنی جم کر اور اتنی کھل کر تنقید ہوتی تھی کہ یاروں کو پسینے آجاتے تھے، ہم جیسے طفلانِ مکتب کو بھی ادب اور تہذیب کے دائرے میں رہتے ہوئے اظہار خیال کی مکمل آزادی حاصل ہوتی تھی۔

کبھی کبھی باہر سے کوئی ادیب اور شاعر بھی آجاتا تھا تو اس کے اعزاز میں خصوصی جلسہ ہوتا اور اس دن پھر صرف مہمان کو اپنی تخلیق سُنانے کا حق ہوتا تھا۔ خلیل الرحمن اعظمی، ڈاکٹر راہی معصوم رضا، بلراج مینرا اور سریندر پرکاش بلکہ خود سجّاد ظہیر یعنی بنّے بھائی بھی ان اعزازی جلسوں کا شکار ہو چکے ہیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک بار مشہور افسانہ نگار بلراج مینرا کے اعزاز میں بھی ایک جلسہ ہوا تھا۔ یہ جلسہ بھائی لطیف کے گھر یعنی فرنگی محل میں ہوا تھا اور جلسے کی صدارت حیات اللہ انصاری صاحب کر رہے تھے۔ میں اُس وقت لکھنؤ یونیورسٹی میں بی۔ اے کا آخری سال کر رہا تھا۔ جلسے میں بلراج مینرا نے اپنا افسانہ "ماچس" سُنایا تھا۔ (حالیہ فلم ماچس کا اس سے کوئی تعلق نہیں)۔ افسانہ مختصر تھا اور اس کے ختم ہونے کے بعد اظہار خیال کی دعوت دی گئی۔ شاید ترتیب نشست کی وجہ سے سب سے پہلے میرا ہی نمبر آیا۔ اُس وقت تک جدیدیت کا دور شروع ہو کر خاصی شدّت اختیار کر چکا تھا۔ میں نے اس افسانے کے چیتھڑے اڑا دیے۔ اپنی بساط کے مطابق اس کے مختلف پہلوؤں پر کُھل کر اعتراض کیا۔ اظہار خیال کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد صدر جلسہ کی حیثیت

سے حیات اللہ انصاری صاحب نے میرے خیالات کی مکمل تائید کی اور مجھے جس فخر و انبساط کا احساس ہوا، اُس کی یاد آج تک میرے ساتھ ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب بلراج مینرا کو اپنے افسانے کے دفاع کا موقعہ دیا گیا تو انھوں نے صرف اتنا کہا کہ انھوں نے آج تک اتنا با مقصد ادبی جلسہ نہیں دیکھا تھا۔ ان کا آخری جملہ تھا "بھائی خوب ہے لکھنؤ اور خوب ہیں لکھنؤ کے لوگ"۔ اس لکھنؤ اور لکھنؤ کے ان لوگوں کے سب سے تابندہ اور درخشندہ نمائندے حیات اللہ انصاری صاحب ہیں۔
مجھے اپنی کم مائیگی کا احساس ہے اور یہ اعتراف کرتے ہوئے مجھے کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ حیات اللہ انصاری صاحب کی ہمہ گیر شخصیت اور اردو دنیا کو ان کی دین کا احاطہ کرنے میں یہ مختصر مضمون نہ صرف تشنہ بلکہ ناکام رہ گیا ہے۔ لیکن صرف ایک سیمینار ان کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کے لیے کافی بھی نہیں۔ میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ ان کا سایہ ہمارے سروں پر قائم رہے اور ان کی اپنے درمیان موجودگی ہمارے لیے تحریک اور انسپریشن کا ذریعہ بنتی رہی۔ آمین

شافع قدوائی

حیات اللہ انصاری کی اداریہ نگاری

چند نمایاں پہلو

اردو صحافت کی ۱۷۵ سالہ تاریخ پر بیک وقت نظر ڈالنے سے منکشف ہوتا ہے کہ چند استثنائی مثالوں سے قطع نظر اردو اخبار و جرائد نے محض اطلاعات کی معروضی اور بے کم و کاست ترسیل کو اپنا اولین مقصود نہیں قرار دیا بلکہ جدید صحافت کے مقررہ تین مقاصد یعنی اطلاع، تفریح اور تعلیم و تلقین میں سے آخر الذکر نصب العین کو روزِ اول سے اساسی اہمیت دی۔ جام جہاں نما سے لے کر عہد حاضر تک کے اردو اخبارات میں خبروں کی اشاعت کے ساتھ ساتھ رائے عامہ کو بیدار کرنے اور ذہن سازی کے لیے ترغیبی مواد Persuasive Material کی شعوری اشاعت پر توجہ مرکوز کی جاتی ہے۔ ترغیبی مواد اصلاً اداریہ، شذراتی نوٹس اور مضامین پر مشتمل ہوتا ہے اور یہ مواد ایک متعین نصب العین کے حصول کی طرف راجع ہوتا ہے۔ اردو کے اولین ہفتہ وار جام جہاں نما کا مقصد عیسائی مشنریوں کی سرگرمیوں کے خلاف عوام کو متنبہ کرنا اور اولین اردو روزنامہ دہلی اردو اخبار کا بنیادی سروکار فرنگیوں کے مظالم کی خونچکاں داستان بیان کرنا تھا اور اسی باعث اس کے مدیر مولوی محمد باقر کو اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنا پڑا۔ سرسید، ظفر علی خاں، مولانا محمد علی، ابوالکلام آزاد، حسرت موہانی اور مولانا عبدالماجد دریا بادی وغیرہ کی صحافتی کاوشیں اسالیب بیان کے تنوع سے قطع نظر موضوعاتی اعتبار سے باہم متحد اور مربوط تھیں

کہ ان سب کا مقصد طوقِ غلامی کو اتار پھینکنا اور عوام میں آزادی کا صور پھونکنا تھا اس مقصد کے حصول کے لیے اخبار اداریوں اور مضامین پر خاص توجہ دی گئی۔ ایک دانائے راز نے اردو صحافت کو اصلاً احتجاجی صحافت قرار دیا ہے کہ اردو صحافت نے ابتدا ہی سے غیر ملکی تسلّط کے خلاف پُرشور احتجاج، جو عین درست تھا، کو اپنا اولین فریضہ گردانا۔ آزادی کے بعد بھی اردو صحافت کے مزاج میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی اور مقبول عام ہفت روزوں کے مشمولات پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب ان کا بنیادی مسئلہ مسلمانوں کے خلاف امتیازی سلوک کے واقعات کو بے نقاب کرنا اور اس پر صدائے احتجاج بلند کرنا ہے جس کی ہمارے جمہوری معاشرہ میں پوری گنجائش ہے۔ شعلہ بیانی، خطابت اور جذباتی ردعمل کو برانگیخت کرنے والا اسلوب عموماً اردو صحافت کو خوش آتا ہے۔ یوں بھی ہے کہ فی الوقت ملک کے طول و عرض سے شائع ہونے والے ۲ ہزار ۳ سو ۴۳ اُردو اخبارات میں سے ۹۵ فی صد سے زائد اخبار شخصی ملکیت میں ہیں جس کے باعث مدیر جو اکثر صورت میں اخبار کا مالک ہوتا ہے، اپنی شخصیت کو نمایاں کرنے کا پورا موقع ملتا ہے اور شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں اخبار کے اداراتی صفحہ کا رول بنیادی ہوتا ہے۔

اس پس منظر میں اگر اردو کے کہنہ مشق صحافی حیات اللہ انصاری کے صحافتی اکتسابات کا اگر بہ نظر غائر جائزہ لیا جائے تو ان کے اداریوں اور اداراتی شذروں سے اس دعویٰ کی کسی حد تک تکذیب ہو جاتی ہے کہ جذباتی اشتعال، خطابت اور دانشگاف اظہاری، پیرایۂ بیان اردو صحافت کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ حیات اللہ انصاری نے زمانۂ طالب علمی کی صحافتی کاوشوں سے قطع نظر ۱۹۳۰ء میں کانگریس پارٹی کے ہفتہ وار ہندوستان (لکھنؤ) سے اپنی صحافت کا عملی آغاز کیا پھر ۱۹۴۵ء سے جون ۱۹۷۲ تک روزنامہ قومی آواز (لکھنؤ) کے مدیر رہے۔ ایک دل چسپ بات یہ کہ انصاری صاحب نے اپنی صحافت کا آغاز بھی کانگریس کے ترجمان ہفتہ وار ہندوستان سے کیا اور بہ حیثیت صحافی ان کی آخری وابستگی کانگریس کے ہفت روزہ

اخبار "سب ساتھ" سے رہی۔ حیات اللہ انصاری ۱۹۷۳ء سے ۱۹۷۶ء تک "سب ساتھ" سے منسلک رہے۔ حیات اللہ انصاری کی صحافتی خدمات علی الخصوص ان کی اداریہ نویسی کی امتیازی صفات کو موضوع گفتگو بنانے سے قبل یہ واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حیات اللہ انصاری کی وابستگی شخصی اخبارات کے بجائے کسی تنظیم یا لمیٹڈ کمپنی کے اخبار سے رہی اور انھیں کسی مخصوص شخص کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان رہنے یا کسی شخصیت کے گرد ایک مقدس ہالہ تعمیر کرنے کے بجائے بعض متعین اصولوں اور پالیسیوں کی ہم نوائی، دفاع اور ان کے مضمرات سے عوام کو واقف کرانے کی دشوار گزار ذمہ داری تفویض کی گئی۔ شخصیت کے بجائے نظریات کو موضوع بحث بنانے میں جذباتیت کی جگہ منطقی دلائل اور منفی جذبات بھڑکانے کے بجائے مثبت ردعمل بیدار کرنا ایک حد تک لازمی ہو جاتا ہے۔ حیات اللہ انصاری نے قومی آواز کی وساطت سے اردو صحافت میں جن نئے صوری اور معنوی امکانات کی منزلوں کا پتہ دیا اور اردو کی روزنامہ صحافت کو جن نئی انقلابی جہتوں سے آشنا کیا ان کا ذکر کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھا ہے سردست حیات اللہ انصاری نے قومی آواز کے اداریوں میں جن امتیازی صفات کو برتا ان کا ایک اجمالی جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔

اداریہ اصلاً ایک نوع کی نصیحت ہوتا ہے جس کا بنیادی مقصد خبروں کے پس منظر، پیش منظر اور نتائج و عواقب کے تفصیلی تجزیے کے ساتھ قارئین کی رہنمائی کرنا ہوتا ہے۔ خبروں کی پیش کش میں معروضیت کا لحاظ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ خبروں میں کہیں بھی واحد متکلم میں یا ضمیر ہم کا صیغہ استعمال نہیں ہوتا اور متعلقہ معاملہ کے حسن و قبح کا فیصلہ قارئین کے صواب دید پر چھوڑ دیا جاتا ہے مگر اداریہ میں یہ صورت نہیں ہوتی۔ اداریہ نویس کو ایک بیدار مغز اور دیانت دار جج کی طرح صحیح یا غلط کا فیصلہ کرنے اور اس کا برملا اظہار کرنا ہوتا ہے۔ مفاد عامہ کو ہمہ وقت پیش نگاہ رکھنے کے باعث اداریہ نویس کی رائے بظاہر موضوعی ہونے کے باوجود یکسر موضوعی (subjective) نہیں رہتی۔ حیات اللہ انصاری ایک

سیاسی جماعت کے ترجمان کے مدیر تھے تاہم قومی آواز میں شائع ہونے والے اداریوں پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مدیر نے محض کانگریس کی جا و بے جا حمایت تک خود کو محدود نہیں رکھا بلکہ اکثر مرکزی اور ریاستی حکومت کی غلط اندیش پالیسیوں پر سخت نکتہ چینی بھی کی۔ موضوعاتی سطح پر حیات اللہ انصاری کا ایک اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اقتصادی مسائل پر سنجیدہ غور و فکر کی دعوت دی اور ان بظاہر خشک موضوعات پر بے شمار اداریے اپنے اخبار میں شائع کیے۔ مرکزی بجٹ پر ہمیشہ قومی آواز کے ادارتی کالموں میں مسلسل اظہار خیال کیا گیا اور کانگریس کی متعین سوشلسٹ پالیسی کے نقطۂ نظر سے بجٹ کے مندرجات کا جائزہ لیا گیا اور اگر بجٹ میں سوشلزم سے انحراف نظر آیا تو اس کی بھی برملا نشان دہی کی گئی۔ اس نوع کی ایک مثال ملاحظہ کریں:

مرکزی بجٹ:

"جو بات سب سے نمایاں ہے وہ یہ کہ بجٹ میں بھونیشور کے فیصلے یعنی سوشلزم سے بہت دور ہے۔ اس میں کوئی ایسی بات نہیں جس سے سمجھا جائے کہ یہ سوشلزم کا پہلا بجٹ یا پہلا قدم ہے اور اس بجٹ نے سرمایہ داری کی راہ میں جو دھیرے دھیرے طاقت پکڑتی جا رہی ہے کوئی بڑی رکاوٹ نہیں کھڑی کی اور نہ پبلک سرمایہ کو زیادہ طاقت ور بنانے کے لیے کوئی بڑا اقدام کیا۔ یہی دو بنیادی باتیں ہیں جو ہم کو سوشلزم کی طرف لے جاتی ہیں۔

مگر بجٹ میں کاریگری ضرور صَرف کی گئی ہے اور اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاتا ہے کہ کسی طبقے پر کوئی خاص بار ڈالے بغیر دفاع کے لیے آٹھ ارب اٹھارہ کروڑ روپے نکالے گئے ہیں اور منصوبے کے لیے پندرہ ارب سولہ کروڑ روپیہ نکالا گیا ہے۔ ان دونوں باتوں کے علاوہ بعض پہلوؤں سے زرعی اور صنعتی پیداوار کی ہمت افزائی کی گئی ہے۔

یہ پالیسی کہ سب کو تھوڑا تھوڑا خوش کیا جائے اور کسی کو بھی زیادہ ناراض نہ کیا جائے اب زیادہ دنوں نہیں چل سکتی ہے۔ ملک اب ایسے موڑ پر آ گیا ہے کہ

جرأت اور بہادری کے ساتھ سوشلزم کی طرف قدم نہیں بڑھایا جاتا ہے تو سرمایہ داری طاقت پکڑ کر ملک کے پاؤں میں ایسی بیڑیاں ڈال دے گی کہ وہ پھر ایسا قدم اٹھا ہی نہیں سکے گا۔"
(قومی آواز ۳ مارچ ۶۴ء)

اسی طرح ٹیکس اور قیمتوں کے باہمی ربط اور ٹیکس عائد کرنے کے بنیادی مقاصد کی نشان دہی کرتے ہوئے "قومی آواز" کے ۳ ستمبر ۱۹۶۵ء کے شمارہ میں ایک اداریہ بعنوان ٹیکس اور قیمتیں شائع ہوا جس کا ایک اقتباس ملاحظہ کریں جو اداریہ نویس کی معاشی بصیرت پر دال ہے۔

ٹیکس اور قیمتیں:

"ٹیکسوں کا مقصد صرف روپیہ اکٹھا کرنا نہیں ہوتا بلکہ ان کا مقصد معاشی نظام کے ٹیڑھے پن کو درست کرنا بھی ہوتا ہے اس وقت ہمارے یہاں ملا جلا معاشی نظام قائم ہے جو نہ پوری طرح سوشلسٹ طرز کا ہے اور نہ تمام تر سرمایہ دارانہ ڈھنگ کا۔ شری کرشنا چاری نے اسے بجا طور پر دو اسٹولوں پر ایک ساتھ کھڑے ہونے کی کوشش سے تعبیر کیا ہے اس صورت حال کی مجبوری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ اگر ہم ایسا سماج لانا نہیں چاہتے جس میں ہر چیز سرکاری ملکیت میں ہو تو حکومت صرف اتنا ہی کر سکتی کہ جو پورے معاشی نظام کے لیے مفید نہیں ہے ان کو برابر چھانٹتی رہے۔ یہ بات انھوں نے وراثت ٹیکس، تحفہ ٹیکس اور اخراجات ٹیکس کے جواز میں کہی ہے۔ اور اس طرح سماج کا ٹیڑھا پن کسی حد تک درست ہو سکتا ہے مگر یہ تدبیر کافی نہیں ہے جتنی ضروری یہ بات ہے کہ کثیر آمدنی، ضرورت سے زیادہ دولت اور بغیر کمائی ہوئی رقم کا ایک حصہ اور آمدنی کے اعتبار سے سماج میں جو نچلے درجے پر ہیں ان پر کوئی بڑا بار نہ ڈالا جائے اور انھیں اوپر اٹھانے کی کوشش کی جائے۔ سوشلسٹ طرز کی منصوبہ بندی کا یہ ایک بنیادی مقصد ہے اور اگر منصوبوں پر عمل درآمد کے باوجود عام لوگوں کی ضرورت والی چیزیں مہنگی ہوتی رہیں تو سوشلسٹ راج بس دور کا ڈھول بنا رہے گا۔"

اسی طرح پراویڈنٹ اسکیم کے تحت آنے والے ملازمین کے لیے جب حکومت نے پنشن اسکیم کا منصوبہ پیش کیا تو 'قومی آواز' نے اس کے مضمرات کی نشان دہی کرتے ہوئے اپنے ادارتی نوٹ میں لکھا:

پنشن اسکیم:

"مرکزی وزیر مالیات نے راجیہ سبھا میں بجٹ پر عام مباحثے کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ حکومت ان سب لوگوں کے لیے جو پراویڈنٹ فنڈ کے تحت آتے ہیں پنشن کی اسکیم چلانے پر غور کر رہی ہے۔ یہ سہولت وہ ان لوگوں کو بھی دینا چاہتے ہیں جو کسی دوسرے کی ملازمت کرنے کے بجائے اپنا روزگار خود کرتے ہیں۔ ابھی اس اسکیم کی عام تفصیلات مرتب نہیں ہوئی ہیں پھر بھی پراویڈنٹ فنڈ پانے والے نیز دوسرے لوگوں کے لیے پنشن کا بندوبست سماجی تحفظ کے لیے ضروری ہے۔ . . . . اس سے جہاں ایک طرف تو سماجی تحفظ کا ایک محدود پیمانے پر انتظام ہو جائے گا وہاں دوسری طرف لوگوں کی ماہانہ آمدنی کا ایک حصہ پنشن کے لیے جمع ہو جانے سے افراط زر کی کیفیت کا کچھ سدھار ہو جائے گا جس کا اثر مانگ کم ہو جانے کی وجہ سے قیمتوں کی سطح پر بھی پڑ سکتا ہے۔" (قومی آواز ۱۹ مارچ ۱۹۶۴ء)

معاشی معاملات اور منصوبہ بندی سے متعلق امور پر فکر انگیز بحث اور ان کے مضمرات اور مختلف پہلوؤں کو گنجلک اصطلاحوں اور اعداد و شمار کے جا و بے جا استعمال کے بغیر آسان زبان میں عوام کے گوش گذار کر دینا قومی آواز کا بے مثال کارنامہ ہے کہ اس سے قبل اور اس زمانہ کے اردو روزناموں میں یہ روش عام نہیں تھی مرکزی بجٹ اور ٹیکسوں پر سرسری انداز میں رائے زنی اخباروں کا عام وطیرہ تھا۔ یہ ممکن ہے کہ اس نوع کے تمام اداریے مدیر نے بذات خود سپرد قلم نہ کیے ہوں تاہم Signed Editorial کی عدم موجودگی میں ان اداریوں کے حسن و قبح کا حساب مدیر کے کھاتے ہی میں درج کیا جائے گا۔

ایک بیدار مغز اور فرض شناس مدیر عوام اور حکومت کے درمیان رابطہ کی ایک

اہم کڑی ہوتا ہے اور مفاد عامہ کو ذہن میں رکھ کر حکومت اور عوام کو صائب مشورے دیتا رہتا ہے۔ وہ عوام کی طرح حکومت کی بھی رہنمائی کرتا ہے اور اسے عوام کی بہبود کی خاطر قدم اٹھانے پر راغب کرتا ہے۔ اگر اس نقطۂ نظر سے حیات اللہ انصاری کے اداریوں کا جائزہ لیا جائے تو شاید یہ کہنا مناسب ہوگا کہ ان کے اداریے اکثر دور رس مشوروں پر مبنی ہوتے تھے اور ان کے اداریے انقلابی اور فیصلہ کن حکومتی فیصلوں سے قبل رائے عامہ بھی ہموار کرتے تھے۔ بنکوں کو قومی ملکیت میں لینا اسی نوع کا ایک انتہائی اہم اقتصادی فیصلہ تھا۔ حیات اللہ انصاری نے قومی آواز کے یکم، ۲ اور ۵ جنوری کے شمارہ میں بنکوں کو قومیانے کے ضمن میں تفصیلی اور مدلل اظہار خیال کیا۔ اس کا ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

بنک کا قومیانا:

بنک قرضہ اس صنعت کو دیتا ہے جس کے بارے میں اسے یقین ہوتا ہے کہ وہ نفع پر چلے گا یعنی ہر صورت میں بنک کی نظر اپنے نفع پر رہتی ہے۔ وہ ملک کے نفع نقصان کی ذمہ داری محسوس نہیں کرتا ہے۔

اب لیجیے سوشلسٹ حکومت کو، وہ کسی خاص صنعت یا تجارت یا بنک کے نفع کو نہیں بلکہ سارے ملک کے نفع کو دیکھتی ہے مثلاً حکومت ہند کے سامنے اس وقت سب سے اہم مسئلہ ہے زراعت کی ترقی کا۔ اس لیے وہ یہ چاہے گی کہ کاشتکاروں کو قرضہ دیا جائے اس معاملے میں خطرے بھی مول لیے جائیں اس کے نزدیک اگر دس کاشتکاروں میں سے صرف سات رقم واپس کرسکیں باقی واپس نہ کرسکیں تو بھی کوئی ہرج نہیں ان تین نادہندوں میں سے ایک تو ایسا ہوگا کہ جس نے روپیہ برباد کردیا ہوگا باقی دو نے زمین پر لگایا ضرور ہوگا۔ یہ بات دوسری ہے کہ اس سے روپیہ سے کوئی فوری فائدہ نہیں ہوا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس رقم کے لگانے سے زمین کو کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور پہونچا ہوگا جس سے نفع اب اگر نہیں ملا ہے تو دو تین سال بعد مل سکتا ہے لیکن ملے گا، یعنی پیداوار اچھی ہوجائے گی۔

بنک کاشتکاری کو اس نظر سے کہاں دیکھ سکتا ہے کہ اس کو چاہے قرضہ

نہ واپس ملے لیکن زمین کی پیداوار اچھی ہو جائے اور اگر ایسا ہوگا تو سمجھ لو کہ اس کی رقم واپس مل گئی۔ یہ نظر تو صرف سوشلسٹ حکومت کی ہو سکتی ہے۔

ہماری رائے اب بھی یہی ہے کہ کانگریس کو کوئی نہ کوئی زبردست قدم اٹھانا چاہیئے اور اس راہ میں جتنے خطرے ہوں ان سب کا بہادری سے سامنا کرنا چاہیئے جب تک کانگریس کوئی بڑا قدم نہیں اٹھائے گی ملک یہ محسوس نہیں کرے گا کہ آگے بڑھی۔ اس لئے کانگریس کو کوئی بہت بڑا انقلابی قدم ضرور اٹھانا چاہیئے اور جو قدم ایسا ہوگا ان میں سب سے مقدم ہے بنک کو قومیانا۔ اس طرف کانگریس کو بڑھنا چاہیئے۔"

(قومی آواز یکم جنوری ۶۹ء)

حیات اللہ انصاری نے قومی آواز میں شخصیات پر اداریے لکھنے سے عموماً احتراز کیا تاہم اہم سیاسی، سماجی، ادبی اور علمی شخصیات کی وفات پر ادارتی کالموں میں خراج عقیدت ضرور پیش کیا۔ قومی آواز میں محض مذہبی عالموں، سیاسی و سماجی رہنماؤں، شعراء اور ادیبوں کو خراج تحسین نہیں پیش کیا جاتا تھا بلکہ مختلف علوم و فنون کے ماہرین کے انتقال پر اداریہ یا ادارتی نوٹ شائع کیے جاتے تھے۔ اقتصادی امور کے علاوہ ماہرین اقتصادیات اور سائنس دانوں کے اکتسابات کو بھی مرکز نگاہ بنایا جاتا تھا۔ ہندستان کی منصوبہ بندی کے بنیاد گزار پروفیسر مہالا نوبس کے انتقال پر بھی قومی آواز میں ادارتی نوٹ شائع ہوا۔

پروفیسر مہالانوبس :

پروفیسر پرسنت چندر مہالانوبس کے انتقال سے ہندستان نہ صرف ایک عظیم عالم سے محروم ہو گیا بلکہ ایک ایسی شخصیت بھی ہمارے درمیان سے رخصت ہو گئی جس نے ملک میں منصوبہ بندی کے بالکل اول دنوں میں اس کا راستہ متعین کرنے میں بھرپور حصّہ لیا۔

ڈاکٹر مہالانوبس علم اعداد و شمار میں جو علم ریاضی کی جدید ترین اور بہت اہم شاخ ہے، بین اقوامی شہرت کے مالک تھے لیکن یہ ان کی علمی و ذہنی سرگرمیوں کا صرف ایک پہلو تھا۔ انھوں نے اپنی زندگی پریسیڈنسی کالج کلکتہ میں فزکس کے پروفیسر کی حیثیت سے شروع کی تھی۔ رابندرناتھ ٹیگور نے وشو بھارتی یونیورسٹی قائم کی تو پروفیسر مہالانوبس ہی ان کے دست راست تھے وہ اس کے جنرل سکریٹری تھے۔ معلمی کے میدان میں وہ پریسیڈنسی کالج کے پرنسپل رہے جو اس زمانہ میں کسی یونیورسٹی کی وائس چانسلری سے کم نہ تھا۔

ہندستان کی آزادی کے بعد وہ مرکزی کابینہ کے مشیر برائے اعداد و شمار مقرر کیے گئے اور اس حیثیت سے انھوں نے پہلے پنج سالہ منصوبہ کے خد و خال متعین کرنے میں نمایاں حصہ لیا۔ ۱۹۵۵ سے ۱۹۶۷ تک وہ منصوبہ بندی کمیشن کے ممبر رہے۔ معاشیات اور ترقیاتی معاشیات کے اولین ماہروں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ انھوں نے کلکتہ میں ادارۂ شماریات قائم کیا جو اس وقت ایشیا میں اپنے طرز کا اعلا ترین ادارہ ہے۔" (قومی آواز ۳۰ مئی ۷۲ء)

جمہوریت، سیکولرازم، سوشلزم ایسے اصول تھے جن پر حیات اللہ انصاری کی اداریہ نویسی کی اساس قائم تھی۔ جمہوری قدروں پر مکمل یقین نے انھیں مخالفوں کی رائے کا بھی احترام کرنے اور ان پر ہونے والی زیادتیوں کے خلاف لب کشائی کرنے کی جرأت اظہار عطا کر دی تھی۔ حیات اللہ انصاری عمر بھر فرقہ واریت کے خلاف نبرد آزما رہے اور اس محاذ پر انھوں نے کبھی کوئی مفاہمت نہیں کی۔ اقلیت اور اکثریت دونوں کی فرقہ پرستی ان کی نظر میں مطعون رہی۔ پاکستان کی جماعت اسلامی سے قومی آواز کا نظری اختلاف بالکل سامنے کی بات ہے، مگر جب پاکستان کی حکومت نے جماعت اسلامی پر سیاسی وجوہ کی بنا پر پابندی عائد کی جو اصلاً ایک غیر جمہوری فعل تھا تو حیات اللہ انصاری نے اس پر صدائے احتجاج بلند کی اور قومی آواز کے ۹ جنوری ۱۹۶۴ء کے شمارہ

میں لکھا :

پاکستان میں نئی پابندیاں :

"پاکستان ایک طرف تو اپنے آپ کو اسلامی مملکت کہتا ہے اور دوسری طرف اسلام کی تعلیمات کی بنیاد پر حکومت چلانے کا مطالبہ کرنے والی جماعت کو اس کے حکمرانوں نے ممنوع قرار دیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو اسلام سے اتنی دل چسپی نہیں جتنی کہ اپنے اقتدار سے جس کو وہ ہر قیمت پر قائم رکھنا چاہتے ہیں اگرچہ جماعتِ اسلامی کی پالیسیوں میں بہت سی خامیاں ہیں اور وہ اتنی پارسا نہیں جتنی کہ وہ اپنے آپ کو ظاہر کرتی ہے لیکن اس کو بے نقاب کرنے اور عوام میں اس کا اثر ختم کرنے کی صحیح اور پائیدار تدبیر یہ ہے کہ اس کو اور اس کی مخالف جماعتوں کو عوام کے سامنے اپنی بات کہنے کا پورا پورا موقع دیا جائے اور فیصلہ عوام پر چھوڑ دیا جائے۔ مغربی پاکستان کی حکومت نے ایسے فیصلے کا اختیار اپنے ہاتھ میں لے کر جماعتِ اسلامی پر نہیں بلکہ جمہوریت پر حملہ کیا ہے اور ڈکٹیٹر شپ کو تقویت پہونچائی گئی ہے۔" (قومی آواز، ۹ جنوری ۱۹۶۴ء)

موضوعاتی سطح پر قومی آواز کے اداریوں میں بہت زیادہ تنوع کا احساس نہیں ہوتا کہ حیات اللہ انصاری نے روزمرہ کے اہم واقعات کے علاوہ ہمہ گیر اثرات کے حامل منتخب موضوعات پر تفصیلی اور سلسلہ وار اظہار خیال کیا اور اکثر موضوعات پر کئی کئی قسطوں میں اداریے لکھے۔ دو قومی نظریہ، مسئلۂ کشمیر، ہندستانی مسلمانوں کا لائحہ عمل، فرقہ وارانہ فسادات، فرقہ پرستی اور آزاد ہندستان میں اردو کی اشاعت و ترویج ان کے محبوب موضوعات تھے نیز جمہوریہ ہند کے اساسی اصولوں جمہوریت، سیکولرازم اور سوشلزم کی تبلیغ و دفاع میں بھی ان کا قلم ہمیشہ سرگرم رہا۔ حیات اللہ انصاری اپنے قارئین کی جذباتی اور ذہنی وابستگیوں سے بخوبی واقف ہونے کے باوجود ان کے جذباتی استحصال کو روا نہیں رکھتے تھے یعنی وہ ایسا مواد کبھی نہیں چھاپتے تھے جس سے ان کی جذباتی ہیجان انگیزی کے داعیوں کو تقویت

پہونچے۔ وہ ان میں منطقی طرزِ فکر اور مسائل پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے اور پھر ان سے متعلق اپنی حکمت عملی مرتب کرنے کی تلقین کرتے رہے۔ حیات اللہ انصاری دو قومی نظریے کے سخت مخالف تھے لیکن وہ ہندستانی مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے اور انھیں صائب مشورہ دیتے رہے۔ چھٹی دہائی کے اوائل میں مسلمانوں میں اتحاد کی ایک نئی پُرجوش تحریک چلی اس پر حیات اللہ انصاری کا ردِّ عمل دیکھیے:

مسلمان، مسلمان ایک ہوں:

"یہ نعرہ اس وقت کئی سمتوں سے اُٹھ رہا ہے کہ مسلمان، مسلمان ایک ہو جائیں۔ ہمیں بھی یہ نعرہ پسند ہے اور ہم بھی چاہتے ہیں کہ مسلمان، مسلمان ایک ہو جائیں۔ لیکن نعرہ لگانے والوں کے دل میں صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ مسلمان ایک ہو جائیں بلکہ یہ بھی ہے کہ ایک ہو کر ان کے بتلائے ہوئے سیاسی راستہ پر چلنے کے لیے ایک ہوں۔ قومی آواز کا ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ مسلمان ایک نہ ہوں اس کا منشا یہ ہے کہ مسلمان ایک ہوں اور ضرور ہوں لیکن ایسے راستہ پر چلنے کے لیے ایک ہوں جو تباہی کی طرف نہ جاتا ہو، بلکہ اخلاق اور کامیابی کی طرف جاتا ہو۔ اخلاق کو ہم وقتی کامیابی پر مقدم رکھتے ہیں۔ آج کا بہت نازک دور ہے اور نازک دور میں سہارا جو دیتی ہے وہ ہے اخلاق۔ اور کشتی کو منجدھار سے نکال کر جو چیز ساحل تک پہنچاتی ہے وہ اخلاق ہے۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے تو بھی ہمارے سامنے یہ چیز روشن ہو جائے گی کہ فلاں فلاں سیاسی راستہ اخلاقی رو سے صحیح ہے اور فلاں فلاں اخلاقی راستہ اخلاق کی رو سے خراب ہے۔ اس لیے ہمارا خیال ہے کہ مسلمان، مسلمان ایک ہوں کی بحث کو اس طرح طے ہونا چاہیے کہ مسلمانوں کے لیے کون سا سیاسی راستہ ایسا ہو سکتا ہے جو کہ اخلاقی لحاظ سے تمام راستوں سے بلند ہو۔" (قومی آواز ۲۸ مارچ ۶۴ء)

اخلاق کو رہنمائی کا بنیادی وسیلہ قرار دینے کے مشورے کو بلا خوف تردید صائب

کہا جا سکتا ہے۔ مسلمانوں کے مسائل اور ان کے مستقبل کے لائحہ عمل پر مسلسل اظہار خیال بعض حضرات کو ناگوار بھی گزرتا تھا کہ حیات اللہ انصاری کے مشورے جذباتی اپیل سے گریزاں ہوتے تھے۔ کسی مسئلہ پر مسلسل اظہار خیال شاید ہفت روزہ صحافت کا اثر تھا کہ حیات اللہ انصاری نے اپنی صحافت کا آغاز ہفت روزہ ہندوستان سے کیا تھا تاہم ان کے سلسلہ وار اداریے تکرار خیال اور خطابت کے فنی حربوں کے پیہم استعمال سے عبارت نہیں ہے لہٰذا اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔

حیات اللہ انصاری کے اداریے اکثر منطقی Arguementative Editorial ہیں مگر بسا اوقات استہزائی اور تمسخرانہ اسلوب بیان اختیار کر کے مناظرانہ اور Editorial of Refutation لکھے ہیں جن کا مقصد تمثیل، حکایت یا دیگر Rhetorical Devices سے کسب فیض کر کے مخالف کے نقطۂ نظر کو یکسر رد کرنا تھا۔ چین اور روس کے اختلافات کو موضوع بحث بناتے ہوئے اداریہ نگار نے چین کے توسیع پسندانہ عزائم کے محرکات کا سراغ چین کے اجتماعی لاشعور سے لگایا۔

"چین اور روس کے اختلافات:

چین ایک زمانے میں دنیا کی ایک بہت بڑی سلطنتوں میں سے ایک تھا اور اس کا حدود اربعہ کافی دور تک پھیلا تھا پھر وہ سلطنت سمٹتی اور پھیلتی رہی۔ کبھی تو چین کے کسی شاہ نے کچھ دنوں کے لیے آس پاس کی آزاد حکومتوں پر قبضہ کر لیا تھا، جو جلد ہی پھر آزاد ہو گئیں مگر موجودہ حکومت ان تمام علاقوں کو جو کبھی بھی چین کے قبضے میں آ گئے تھے، چین کا ضروری جزو مانتی ہے اور جو لوگ ان کو چین سے الگ کرنا چاہتے ہیں ان کو غاصب مانتی ہے صرف اتنا ہی نہیں بلکہ چین کی زباں زد کہانیوں میں سے اگر کسی میں یہ کہا گیا ہے کہ فلاں فلاں ملک پر کسی چینی شہزادے نے قبضہ کر لیا تھا تو چین کی حکومت اسے بھی اپنی ملکیت کہتی ہے۔

چین کی زباں زد کہانیوں میں دنیا کی سب سے بڑی سلطنت مانا گیا ہے چنانچہ موجودہ چینی حکومت سمجھتی ہے کہ اس کا حق ہے کہ وہ اپنی سلطنت کو دنیا کی

سب سے بڑی اور طاقتور سلطنت بنائے اور اگر کوئی حکومت اس کی راہ میں حائل ہوتی ہے تو وہ بے جا کام کرتی ہے۔"   (قومی آواز یکم مارچ سنہ ۶۴ء)

ظاہر ہے کہ یہ اداریہ مدیر کے جذبۂ حب الوطنی کو تو نشان زد کرتا مگر چین کے توسیع پسندانہ عزائم کی فکری اساس پر روشنی نہیں ڈالتا۔ حیات اللہ انصاری نے بسا اوقات مخالف نقطۂ نظر کی بے بضاعتی کو اجاگر کرنے کی غرض سے پہلے تعمیمات وضع کیں اور پھر اس تناظر میں مسئلہ کو دیکھا۔ ۱۹۶۴ میں ہند چین جنگ کے بعد جب ہندستانی فوجیوں کو حکومت ہند نے اعزاز دیا تو اس قومی تقریب کا چینی سفارت کاروں نے بائیکاٹ کیا اس پر قومی آواز کا ادارتی تبصرہ ملاحظہ کریں :

"بہادر کی عزت :

اب سیاست شخصی نہیں رہی اس کی ذات پات بالکل بدل چکی ہے اور اس وجہ سے سیاسی دوستیوں اور دشمنیوں کا معیار بھی بدل گیا ہے لیکن اس کے باوجود لوگ آج بھی بہادر کی عزت کرتے ہیں اور اس عزت کو دوستی اور دشمنی سے بالاتر سمجھتے ہیں۔ ہم کو یقین ہے کہ ہمارے دشمن چینی بھائی بھی کوئی بہادری دکھلائیں تو ہندستانی اس بہادری کی بھی قدر کریں گے اور اسے بھی خراج عقیدت پیش کریں گے اس معاملہ میں جو خیال ہندستان کا ہے وہ دنیا بھر کا ہے، آج بھی ساری دنیا کے عوام بہادری کی قدر کرتے ہیں اور اس قدر کو اچھی چیز سمجھتے ہیں۔

چینی نمائندوں کی یہ حرکت کہ جب صدر جمہوریہ ہندستانیوں کو جنھوں نے اپنے ملک کے دفاع میں زبردست بہادری دکھلائی تھی، اعزاز دینے لگے تو وہ جلسہ سے اٹھ کر چلے آئے ایسی حرکت ہے جسے ساری دنیا میں پست قرار دیا جائے گا اور ہر جگہ کے عوام یہاں تک کہ اگر چین کے عوام کو معلوم ہو تو وہ بھی اس پر نفرین کریں گے۔"

موضوعات سے قطع نظر حیات اللہ انصاری نے اسلوب کی سطح پر اردو صحافت کو نئی جہتوں سے آشنا کیا۔ حیات اللہ انصاری کے اداریوں کا مزاج مختلف اسالیب

کے امتزاج سے مرتب ہوتا ہے اور ان کے اسلوب کا مابہ الامتیاز عنصر منطقی طرز استدلال ہے۔ انھوں نے اداریوں میں طنز، استہزا، تمسخر، حسرت، تاسف اور غصہ کے اسالیب آزمائے۔ حیات اللہ انصاری کے اسلوب پر بھی خطیبانہ رنگ چھایا ہوا ہے جو پیہم سوالات کی آویزش سے مشکل ہوتا ہے۔ انھوں نے تحریر کی خواندگی Readability کو بڑھانے کی خاطر Rhetorical questions سے خاصا استفادہ کیا۔ انھوں نے طنز، تمسخر اور استہزا کے ساتھ غم، غصہ اور خوف کے بھی اسالیب آزمائے اور رعایت لفظی، تلمیح، تمثیل، استعارہ، کنایہ اور اشعار نیز مصرعوں کے برمحل استعمال سے اپنے اداریوں کی انفرادیت قائم کی۔ حیات اللہ انصاری نے اداریتی کالم کی پیشانی پر برمحل شعر لکھنے کی روایت ڈالی۔ حیات اللہ انصاری نے آزادی کے بعد مسلمانوں میں مایوسی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے کو دور کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا اور قومی آواز کے اداریتی کالم کو غیر یقینی اور جمود و تعطل کے دور میں مکالمہ کا بنیادی ذریعہ بنایا اور اس کی وساطت سے معاشرتی اصلاح کا فریضہ بھی انجام دیا اور اردو صحافت میں مثبت نقطۂ نظر کے نئے امکانات کی خبر دی۔ اس طرح اپنی تحریروں کی بدولت سے ایک دانائے راز کے اس انگریزی قول کی تردید کر دی کہ :

Urdu Journalism without Fire Work is like Wimbledon without Ice Cream and Straw Barries

یادوں کے آئینے میں

حیات اللہ انصاری

مولانا ابو الکلام آزاد کا "الہلال" اور "البلاغ"، مولانا حسرت موہانی کا "اُردوئے معلیٰ"، مولانا محمد علی جوہر کا "کامریڈ" اور "ہمدرد"، حیات اللہ انصاری کا "ہندوستان" اور پھر "قومی آواز"۔

ہمارے سامنے ایک میدانِ صحافت ہے،
جہاں ایک طرف مولانا آزاد
ایک طرف مولانا حسرت
ایک طرف مولانا جوہر
اور ایک طرف
کلوز اپ میں
حیات اللہ انصاری نظر آرہے ہیں۔
چاروں کا مطمح نظر ایک!
ہندوستان کی آزادی!!
تھوڑے تھوڑے وقفے سے
چاروں اِس وسیع میدانِ صحافت میں اُترے، ملک کو آزاد کرائے جانے

کا مقدس جذبہ لے کر۔ چاروں کو اس معاملے میں زبردست کامیابی ملی۔

مولانا جوہر آزادی سے بہت پہلے اللہ کو پیارے ہوئے۔

مولانا آزاد اور مولانا حسرت آزادی کے دن رات دیکھتے رہنے کے بعد یکے بعد دیگرے دنیا سے رخصت ہوئے۔

بے انتہا خوشی کی بات ہے حیات اللہ انصاری صاحب بحمداللہ بہ نفس نفیس ہم میں موجود ہیں۔

ان چاروں کی شخصیات عبقری ہیں۔ صحافت اُن کا مشن تھا آج افسوس ہمارا پروفیشن ہے)

کہنے دیجئے۔ آج کا زیادہ تر، بلکہ بیشتر، کوئی بھی پندرہ روزہ، ہفت روزہ یا روزنامہ اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ وہ چاہے کلکتے سے نکلتا ہو، چاہے بمبئی سے، مدراس، بنگلور، حیدر آباد، دلّی، لکھنؤ، کانپور، پٹنہ، الہ آباد، یا اس ملک کے کسی بھی شہر یا قریہ سے کم ہی ایسا ہوتا ہوگا، جس میں سنسنی خیزی، سطحیت، عامیانہ پن، پھکڑپن، جانب داری، فرقہ واریت یا بلیک میلنگ وغیرہ والی بات نہ ہو۔ زبان کی قید نہیں۔ اس حمام میں سبھی ننگی، چاہے ہندی ہو، چاہے انگریزی، چاہے اردو۔ یہ دوسری بات ہے، اس معاملے میں ہماری قومی زبان سب سے آگے ہے۔ خیر، ابھی چھوڑیے اس بحث کو۔ بات ہو رہی تھی بلندیوں کی، یہ پستیاں کدھر سے در آئیں ؟

میں تو عرض کر رہا تھا :

اردو کے عظیم ناول نگار : حیات اللہ انصاری
اردو کے عظیم افسانہ نگار : حیات اللہ انصاری
اردو کے بڑے منفرد صحافی : حیات اللہ انصاری
پکّے، کھرے، مجاہدِ آزادی : حیات اللہ انصاری
یکساں ظاہر و باطن والے : حیات اللہ انصاری

اور بس پانچ ہی نہیں، مزید، متعدد عنوانات سے ان پر کہا اور لکھا پڑھا جا سکتا ہے۔

سفید کھدّر کی ٹوپی، شیروانی، چوڑی دار پاجامہ، چمکتا ہوا سیاہ پمپ شو، آنکھوں پر سنہری فریم والا، موٹے شیشوں کا چشمہ لگائے۔ میانہ قد والے، گورے چٹے، ہمیشہ نرم لہجے میں گفتگو کے عادی۔ . . 'قومی آواز' کے دفتر میں اپنے مخصوص چیمبر میں فروکش، یا پھر انجمن ترقی اردو کے کسی چھوٹے بڑے جلسے میں تقریر کرتے ہوئے، کسی ادبی اجتماع، سیمینار، یا پھر کانگریس کے کسی بڑے اجلاس میں، سمجھانے والے انداز میں بولتے ہوئے۔

جب میں نے ان کو پہلی بار دیکھا تھا تو ابھی میری عمر کی دوسری دہائی بھی پار نہیں ہوئی تھی۔ گورکھپور میں ہم چند طالب علموں نے ایک انجمن فروغ اردو کے نام سے بنا رکھی تھی۔ لکھنؤ ان کی خدمت میں دعوت نامہ بھیج دیا گیا۔ خواب میں بھی یقین نہ تھا قدم رنجہ فرمایا جائے گا۔ مگر ہم سب کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ حیات اللہ انصاری صاحب تشریف لائے ہوئے ہیں اور حکیم ابوالکلام صدیقی کے ہاں قیام پذیر ہیں۔ حکیم صاحب کے ہاں جا کر نیاز حاصل کرنے کی سعادت حاصل کی گئی۔ . . . شام کو جلسہ گاہ میں کچھ ہی لوگ تھے، مگر حیات صاحب کی تقریر جوں ہی شروع ہوئی، مولانا عبدالحنان صاحب مظاہری مرحوم کا وسیع احاطہ کھچا کھچ بھر گیا۔

اُن دنوں حیات صاحب کی کہانیاں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر پڑھی جاتی رہیں اور 'قومی آواز' تو روز ہی صبح صبح اپنا جلوہ دکھاتا رہا۔ 'میزبان' کی گلوریاں ایک عجیب سا لُطف دیتیں۔ سلیقے سے سجی سجائی، چھوٹی بڑی خبریں اور سب سے بڑھ کر، چھوٹے چھوٹے، سیدھے سادے دل کش جملوں والا اداریہ۔ قومی آواز کے میزبان بھی وہی حیات اللہ انصاری صاحب، ایسے چبھتے اداریے لکھنے والے بھی وہی حیات اللہ انصاری صاحب!

لکھنؤ میں پہلی بار قیصر باغ میں جب "قومی آواز" کے گلابی رنگ والے دفتر پہونچا تو ڈرتے ڈرتے، پھر سوچا گورکھپور میں خاصی شفقت سے پیش آئے تھے چلو یہاں بھی وہی صورت ہوگی۔ جو سوچا تھا اس سے بھی سوا پایا۔ بھلا ایسے ظرف والے اور کہاں؟ جو چھوٹوں کو یوں سر آنکھوں پر بٹھائیں۔ وہیں عشرت صاحب کو پہلی بار دیکھا۔ عثمان غنی اور مرحوم منظر سلیم، احمد جمال پاشا اور احمد ابراہیم علوی سے پہلی بار ملا۔ یہ سبھی لوگ قلم کے دھنی، میں سمجھتا ہوں اور شاید غلط نہیں سمجھتا ہوں کہ دین ہیں حیات اللہ انصاری صاحب کی!

"قومی آواز" کو سارے ملک میں منفرد مقام پر پہونچانے والے حیات صاحب کے بارے میں اپنے یہ حقیر تاثرات پیش کرتے ہوئے ایسا لگتا ہے جیسے چھوٹے منھ سے بڑی بات نکالنے کی جسارت کی جارہی ہو۔

"قومی آواز" کا ضمیمہ جس کے انچارج منظر بھائی مرحوم تھے، اُن دنوں حیات صاحب کا ایک بڑا ادبی کارنامہ تھا۔ چھٹ بھیّوں کو اس میں جگہ نہیں ملتی تھی۔ کسی مُبتدی کے لیے قومی آواز کے ضمیمے میں جگہ پانے کے لیے سوچنا بھی آسان نہ تھا۔ ایک صاحب جو خاصے بزرگ تھے اور مقامی طور پر بڑے شاعروں میں شمار ہوتے تھے، چوٹ کیا کرتے۔ ابھی صاحب زادے ہو' اس میں چھپ کر دکھاؤ تو شاعری چھوڑ دوں . . . . '، میں نے جرأت کی۔ اور جب میری ایک چھوٹی سی نظم قومی آواز کے ضمیمے میں پہلی بار نمایاں طور پر چھپی ہوئی دکھائی دی تو وہ صاحب (اللہ غریق رحمت کرے) ہفتوں نظر نہ آئے۔ بعد کو پتہ چلا حیات اللہ صاحب کی خدمت میں بھیجی گئی یہ نظم جب منظر سلیم کو دی گئی تو انھوں نے بغیر کسی کتربیونت کے نمایاں طور پر شائع کر دیا۔ بعد کو منظر صاحب سے براہ راست رابطہ قائم ہو چکا تھا۔

میری کہانیاں، نظمیں، غزلیں برابر قومی آواز کی زینت بنتی رہیں۔

جیسا کہ سبھی کو معلوم ہے حیات صاحب گاندھیائی فلسفے کے شروع سے ہی حامل ہیں، اور اسی پر پورے طور پر عامل۔ کٹر کانگریسی، فرقہ واریت کے

دشمنِ جانی ۔ وہ چاہے سیاست میں ہو چاہے صحافت میں، چاہے ادب میں ......
حیات صاحب چپ بیٹھنے والوں میں نہیں ۔ ترقی پسندی ان کو پسند ہے مگر زرے کام ڈیڈوں والی نہیں ۔ دین داری اُن کا ایمان ہے ۔ مگر دین میں گندی باتیں ملانے والوں کی نہیں۔ صحافت میں جہاں بھی کہیں ایسا کچھ دیکھا، قلم اٹھا لیا ... بمقابل عبدالماجد دریاآبادی مرحوم و مغفور ہوں یا مرحوم مودودی صاحب کی جماعت والے کوئی اخبار نویس ۔ اس کے باوجود ان کی شخصیت میں یہ سب سے بڑی اور لائق تحسین خوبی ہے کہ ادب وصحافت کا ہر مکتبۂ فکر ان کا قدر دان ہے ۔ یہ شاید اس لیے کہ ان کے نزدیک نظریاتی اختلافات کا ذاتیات سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا اور وہ اس پر سختی سے کاربند ہیں ۔ وہ چاہے بھاجپا کو بہتر ماننے والے مولانا وحیدالدین خاں صاحب ہوں، یا وہ حضرات جنھیں گاندھیائی فلسفہ سے اللہ واسطے کا بیر ہو ۔

اس میں ذرّہ بھر شک نہیں کہ حیات اللہ انصاری صاحب کی فکر، صداقت سے معمور، پورے طور پر غیر جانب دار اور سیکولر ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں جہاں کہیں بھی فرقہ پروری یا علاحدگی پسندی نظر آئی، ہندوؤں کی کسی سیاسی یا غیر سیاسی پارٹی میں، یا مسلمانوں کی کسی مجلس یا جماعت میں تو بغیر کسی رُو رعایت کے، ان کا بے باک قلم برس پڑا ۔

ملک اور قوم سے محبت اُن کا ایمان ۔ انسانیت اور شرافت سے پیار، اُن کا دھرم ۔ خدا ان کا سایۂ عاطفت ہم شوریدہ سروں پر قائم و دائم رکھے ۔ آمین!

اظہار احمد

مجموعۂ اقدار حیات اللہ انصاری

گزشتہ دو سال سے حیات اللہ انصاری بستر علالت پر تھے پھر بھی ۱۸ فروری ۱۹۹۹ء کو جب ان کے انتقال کی خبر ملی تو ذہن ماؤف سا ہو گیا۔ پھر اسی شام ان کے آبائی قبرستان میں "چند افراد" کے درمیان انھیں الوداع کہتے ہوئے عمیق حنفی کی یہ نظم ذہن میں گونجنے لگی :

اس کے بول بڑے میٹھے تھے
یہ لوگوں کے کام آتا تھا
نیک تھا، سیدھا سچا تھا۔
لوگ جنازہ دیکھنے کو
ایک پل کے لیے
چلتے چلتے رک جاتے تھے"[1]
یا میّت کے رستے سے
ہٹ کر گزر جاتے تھے"[2]
دارا اور جمشید نہیں ہیں
اسکندر اور چنگیز نہیں ہیں....
اکبر اور اشوک نہیں ہیں
تو دنیا میں کون کمی ہے

دُنیا جیسی تھی ویسی ہے
کچھ سانسیں آتی جاتی ہیں
کبھی روتی ہیں، کبھی گاتی ہیں

حیات اللہ انصاری صاحب کی شخصیت۔ ان کے سرخ و سفید چمکتے دمکتے چہرے، ان کی آن بان، وضع قطع۔ شیروانی، چوڑی دار پاجامہ، کلف دار سفید گاندھی ٹوپی سے لے کر اُن کی چال ڈھال تک لکھنوی بانکپن کی آئینہ دار تھی۔ ان کا دستر خوان کسی نوابی دستر خوان سے کم نہ ہوتا تھا لیکن ایک گاندھی وادی خادم کے طور پر وہ خود چائے اور ناشتہ تیار کرتے اور اسے پیش کرتے ہوئے بڑی نفاست اور انکساری کا ثبوت دیتے تھے اور :

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

والے نظام حیات سے لے کر ان کی "کامریڈیت" اور کچن سے لے کر ان کی بیٹھک تک میں جو "کمیون" دیکھنے کو ملتا تھا وہ میں نے کیا میری نسل کے کسی بھی شخص نے کسی "کامریڈ" کے گھر میں بھی نہ دیکھا ہوگا۔

حیات اللہ خانوادۂ فرنگی محل کے چشم و چراغ تھے اور باقاعدہ طور پر درسِ نظامی کے فارغ التحصیل بھی۔ ان کا رہن سہن گاندھی وادی تھا تو نکر مارکسی۔ وہ اپنا کرتا، پاجامہ سینے اور دھونے سے لے کر اپنا صوفہ کرسی تک بنانے، سجانے، سنوارنے کا کام خود کرنے کے عادی تھے۔ گاندھی جی کے آشرم میں رہ کر انھوں نے جو طور طریقے سیکھے ان پر زندگی بھر عمل پیرا رہے۔ وہ طور طریقے انھوں نے ایڈیٹر اور برسر اقتدار پارٹی کا ایم۔ایل۔سی اور ایم۔پی ہونے کے بعد بھی نہیں چھوڑے۔

وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی نشستوں میں بھی برابر شریک ہوتے تھے، افسانے سناتے، بحث و مباحثہ میں شرکت کرتے۔ "گاندھی اور مارکس" کی نظریاتی

کشاکش جو ذہنوں میں ہوتی وہ ایک سطح پر منطقی دلائل اور ادبی موشگافیوں سے نکل کر تلخ کلامی کی حد تک پہنچ جاتی۔ لیکن یہاں بھی ان کا انداز بیان ان کی شیروانی، پاجامے اور ٹوپی کی طرح صاف ستھرا اور کڑک دار ہوتا۔ جس طرح ان کے کپڑوں پر کبھی کوئی دھبہ اور شکن نظر نہ آتی اسی طرح ایسی بحثوں میں جب مارکسی نقاد انھیں زیر کر دیتے اور وہ اکیلے پڑ جاتے تب بھی ان کے چہرے پر کوئی شکن نظر نہ آتی۔

ان دنوں کمیونسٹوں میں عام طور سے "دانش ورانہ" انداز میں مزدوروں اور کسانوں کا ہمدرد ہونے اور ان جیسا دکھنے کے لئے بڑے بڑے بال رکھنے، ملگجے کپڑے پہننے، ایڑی گھسے جوتے یا ٹوٹی چپل پہننے کا رواج تھا لیکن حیات اللہ نے گاندھیائی فکر پر عمل پیرا رہتے ہوئے بھی کبھی گاندھی جی کی طرح لنگوٹی نہیں پہنی۔

حیات اللہ کی شخصیت بعض معاملوں میں بڑی اختلافی اور متنازعہ بھی رہی۔ لیکن ان کی فنی عظمت اور انسان دوستی کے قائل تو ان کے حریف اور مخالفین بھی ہمیشہ رہے۔

> "ایک انسان کی حیثیت سے ان پر حرف گیری کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ وہ مفکر بھی ہیں اور عمل کے قائل ہیں، خاموش بھی ہیں اور باتونی بھی۔ دوست بھی ہیں اور دشمن بھی۔ شوہر بھی ہیں اور باپ بھی۔ گاندھیائی بھی ہیں اور مارکسی بھی۔ مسلمانوں کا درد رکھنے والے بھی ہیں اور اردو کے مجاہد بھی۔ ذہین بھی ہیں اور اہلِ زبان بھی۔ گویا وہ ایک بھرپور زندگی جینے والے ایک بھرپور انسان ہیں[۳۳]"۔

> "ایک ماہر پیراک، گھڑوں، مٹکوں اور آستینوں میں سانپ پالنے کے شوقین، ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کرنے کی مہم بنانے والے، صفِ اوّل کے صحافی، ناول نگار اور افسانہ نویس اپنے مخالفوں کو سرد منطق سے بکھرانے والے حیات اللہ انصاری ایک مجموعۂ اقدار

شخصیت کے مالک ہیں"۔ ۱۴

حیات اللہ انصاری کی اسی مجموعۂ اضداد ہشت پہلو شخصیت نے ہی انھیں شہرت بھی بخشی ———— اور انھیں اختلافی بھی بنایا۔ وہ افسانہ نگار، ناول نگار، ناقد، صحافی، ماہرِ تعلیم، سیاست داں سبھی کچھ تھے۔ ان کی زندگی کے یہ چھ پہلو اور مختلف جہتوں میں کام کرنے کا جذبہ ممکن ہے گاندھی جی کے آشرم کی دین ہو، کیونکہ گاندھی جی بھی صحافی تھے، مصنّف تھے، سیاست داں بھی تھے اور مفکر بھی، ماہرِ تعلیم بھی اور سماج سیوک بھی۔ لیکن ان کی یہ حیثیتیں ضمنی تھیں۔ وہ بنیادی طور پر صرف مصلح تھے، مہاتما تھے، اور کچھ نہیں۔ یہی ان کی عظمت تھی، اور ایسے مصلح اور مہاتما صدیوں بعد جنم لیتے ہیں۔ حیات اللہ کی نظر میں یہ بات نہیں آئی۔ یہیں پر وہ چُوک گئے۔ ورنہ اگر انھوں نے اپنی تمام فنّی، فکری اور عملی توانائیوں کو کسی ایک جانب، کسی ایک شعبہ کے لئے وقف کر دیا ہوتا تو آج اس شعبے میں، اس فن میں ان کا کوئی ثانی نہیں ہوتا۔

افسانہ نگار اور اردو ناول نگار کی حیثیت سے ہم حیات اللہ کا جائزہ بعد میں لیں گے۔ پہلے ان کی صحافتی، تعلیمی اور سیاسی حیثیت پر ایک نظر ڈال لیں۔

ایک صحافی کی حیثیت سے حیات اللہ امر ہیں۔ انھوں نے پوری اردو صحافت کو ایک نیا موڑ دیا، ایک تازگی بخشی، عوام سے لے کر مہذّب اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے کے ہاتھ میں ایک ایسا صحافتی مرقع پیش کر دیا جس کے لئے اردو دنیا ہمیشہ ان کی احسان مند رہے گی۔ اعلا تعلیم یافتہ طبقے کو انگریزی اخبارات سے بے نیاز کر دینے کا عظیم کارنامہ انجام دیا۔ ایک ایڈیٹر کی حیثیت سے صرف یہی نہیں کہ اداریے لکھ کر اپنے کو علاحدہ کر لیتے ہوں بلکہ وہ اس کا بھی اہتمام کرتے تھے کہ خبر کتنی تفصیلی ہو یا کتنی مختصر۔ سُرخیوں میں حروف اور الفاظ کتنے ہوں، سُرخی کتنی سطروں میں لکھی جائے۔ کتابت کتنی جلی یا خفی ہو۔ ترجمہ کیسے کیا جائے۔ کانگریس کی پالیسیوں کو خبروں میں کس خوب صورتی اور چالاکی سے جوڑا

جائے۔ اداریوں میں کانگریسی فکر کو کیسے سمویا جائے۔ اخبار کی کاپی کیسے جوڑی جائے۔ خبریں اوپر اور نیچے جوڑنے میں کیا التزام رکھا جائے۔ خبروں کی اہمیت کو کیسے گھٹایا بڑھایا جائے۔ ڈسک سے کاتبوں تک کاپی پہنچانے کا کیا نیا طریقہ ایجاد کیا جائے۔ لیتھو پر تصاویر کو بہتر سے بہتر کس طرح چھاپا جائے وغیرہ وغیرہ۔

زبان و بیان کے معاملے میں "قومی آواز" نے جو شہرت حاصل کی، اور اشتعال انگیز، جذباتی، شعلہ بیان صحافت سے ہٹ کر فکر انگیز، غیر جانب دارانہ صحافت کی جو نئی راہ نکالی، آج بھی اردو صحافت اسی کے گرد چکر کاٹ رہی ہے (نئے تکنیکی طریقوں اور کمپیوٹر وغیرہ سے قطع نظر) اس سے آگے کا راستہ دکھانے والا کوئی رہنمائے صحافت ابھی تک سامنے نہیں آیا ہے۔

"حیات اللہ نے صرف ادارت تک کام کو محدود نہیں رکھا بلکہ جو فنی خوبیاں صحافت کی تھیں، ان پر بھی توجہ دی۔ آج تک کسی مدیر نے ایسا نہیں کیا تھا۔ ۔ ۔ ۔ انھوں نے اپنے زمانے میں مختلف تجربے ایک معیاری روزنامہ پیش کرنے کے سلسلے میں کیے اور تیس سال میں قومی آواز کو ایک معیار بنا دیا۔ اس میں جذباتیت کے بجائے استدلال کا رنگ پیدا کیا، لاجک لائے۔ جو مولانا ظفر علی خاں نہ کر سکے وہ حیات اللہ صاحب نے صحافت کے میدان میں کر دکھایا۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اپنے خیالات کے لحاظ سے وہ کانگریس کی پالیسی سے ہم آہنگ ہیں لیکن اگر کبھی انھیں اس کے اطلاق میں جھول نظر آیا تو انھوں نے اس پر نکتہ چینی کی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان کا انداز ہمیشہ استدلال پسند، تعمیری اور معتدل پسند رہا۔ اس انداز نے اخبار کو اس قابل بنا دیا کہ اس کے مخالف بھی جوق در جوق اس کی طرف مائل ہوئے۔"[۵۳]

یہ الزام اکثر لگایا جاتا ہے کہ حیات اللہ اور قومی آواز کانگریس کے حرف بہ حرف ترجمان تھے جب کہ یہ حقیقت ہے کہ وہ وقتِ ضرورت اختلاف بھی شدت سے کرتے تھے ۔

"مجھے قومی آواز کا ایک بہت پرانا فائل مل گیا۔ اس کے مطالعہ سے پتہ چلا کہ حیات اللہ صاحب اس زمانے میں سچائی کا راستہ نہیں چھوڑتے تھے۔ وہ کانگرس کی پالیسی سے اختلاف کرتے ہوئے نہیں ڈرتے تھے۔ "قومی آواز" پنڈت نہرو کا اخبار تھا، ظاہر ہے جواہر لال نہرو سے کون اختلاف کر سکتا تھا لیکن حیات اللہ صاحب برملا خود بھی ان سے اختلاف کرتے تھے۔ اختلاف کرنے کا مطلب تھا نوکری جا سکتی تھی مگر انھوں نے رسک لیا۔ اور جواہر لال نہرو چوں کہ خود بھی جمہوری مزاج رکھتے تھے، اس لیے انھوں نے بھی ہمیشہ وسیع القلبی سے کام لیا۔"[٦]

انھیں سب سے زیادہ شہرت دراصل ایک صحافی کی حیثیت سے ہی ملی ۔ قومی آواز کا دورِ ادارت ان کی زندگی کا ایسا دور ہے جس میں انھوں نے اپنی دوسری حیثیتوں کو اُبھارنے کی بھرپور کوشش کی۔ اگر وہ صحافی نہ ہوتے اور قومی آواز ان کی زندگی میں نہ آتا تو یقیناً وہ بہت سی شہرتوں سے محروم رہ جاتے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ صحافت کی دنیا میں نہ آتے تو افسانہ نگار اور ناول نگار کی حیثیت سے وہ دنیا کے صفحہ اوّل کے فکشن رائٹر ہوتے ۔ مثال کے طور پر ان کی سیاسی حیثیت (آزادی کے بعد کی اور گاندھی جی کے آشرم میں رہتے ہوئے نظریہ سازی کے علاوہ) مکمل طور پر قومی آواز کی مرہونِ منت ہے۔ اگر وہ کانگرس پارٹی میں تو ہوتے مگر ان کے ہاتھ میں قومی آواز نہ ہوتا تو وہ اپنے سیاسی نظریات کی نہ تو تشہیر کر پاتے اور نہ ہی ان کا سیاسی نظریہ اور سیاسی بصیرت عوام کے سامنے کھل کر آپاتی۔ قومی آواز کو اردو صحافت کا سنگِ میل بنانے میں حیات اللہ صاحب

نے جس ذہانت، سلیقہ مندی، لگن، انہماک، کمٹ منٹ اور ایثار کا ثبوت دیا، اس کا سیاسی فائدہ بھی انھیں حاصل ہوا، اس سلسلے میں بھی انھوں نے زبردست ذہانت اور سلیقہ مندی کا ثبوت دیا۔

ماہر تعلیم کی حیثیت سے انھیں جو شہرت ملی وہ بھی قومی آواز کی مرہونِ منت ہے۔ ماہرینِ تعلیم کے قول کے مطابق حیات اللہ صاحب کی کتاب "دس دن میں اُردو" اور "دس دن میں ہندی" کوئی خاص سائنسی حیثیت نہیں رکھتی، مگر حیات اللہ صاحب نے جس جرأت اور دلیری کے ساتھ اس طریقۂ تعلیم کو، جو کہ انھوں نے مشہور جرمن ماہر تعلیم "لاباخ" کے طریقۂ تعلیم سے اخذ کیا تھا شہرت دی، اس کی تشہیر کی۔ اس میں بھی قومی آواز کا بھرپور استعمال کیا۔ حرف شناسی ایک ایسا نفسیاتی اور ذہنی عمل ہے جو کسی بھی طرح سکھایا جا سکتا ہے، سکھایا جاتا رہا ہے۔ لیکن دس دن میں اردو۔ ہندی کو جو شہرت ملی وہ حیات اللہ صاحب کی فہم و فراست کی مظہر ہے لیکن یہ بھی نہ بھولنا چاہیے کہ قومی آواز کو ایک معیاری، معتبر، مستند اور ہمہ گیر آواز دینا بھی صرف اور صرف حیات اللہ صاحب ہی کا کارنامہ تھا۔

منشی پریم چند کے انتقال پر فراقؔ گورکھپوری نے، جو ان کے دوست تھے، ایک مضمون میں لکھا تھا کہ " وہ کام کرتے ہوئے جیے اور کام کرتے ہوئے مرے۔ اور جب انجام آیا تو اسی سکون کے ساتھ آیا جو ان کی اکثر کہانیوں کے آخری حصّوں میں نمایاں ہوتا ہے۔" ؎

حیات اللہ صاحب نے "بسترِ علالت" پر جو "آخری کوشش" کی وہ "انجمن ترقی اردو" اور "تعلیم گھر" کی وراثت کو اپنے بیٹے اور بہو کے نام منتقلی کی تھی، جو ان کی معرکۃ الآرا کہانی "آخری کوشش" کے اختتام کے عین مطابق ہے۔

ناول نگار کی حیثیت سے حیات اللہ صاحب کے ناولوں میں سب سے زیادہ مشہور "لہو کے پھول" رہا۔ ان کا یہ ضخیم ناول ۲۶۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں واقعات اور کرداروں کے ساتھ ہی زمان و مکان کے اعتبار سے بھی

بڑی وسعت ہے۔ اس کا کینوس اتنا بڑا ہے کہ فنّی، تکنیکی اور پلاٹ کے لحاظ سے یہ ناول بکھرسا گیا ہے۔ ان خامیوں کے باوجود ناقدین نے اسے متعدد زاویوں سے سراہا ہے۔ بقول شمس الرحمٰن فاروقی :

"حیات اللہ انصاری کے مشاہدے نے ان کو کہیں دھوکا نہیں دیا ہے۔ کانگریس، قوم پرست مسلمان، مسلم لیگ، مسلمان علماء اور مولوی اکثریت کے ایک طبقے میں شروع ہی سے نارواداری اور فسطائی رجحانات کا فروغ مسلمانوں کے بارے میں ان کا مشکوک رویہ، عام قوم پرست مسلمان لیڈروں کا ذہنی اور روحانی دیوالیہ پن، مسلم لیگ کے ہتھکنڈے، کمیونسٹ مسلمانوں کی قلا بازی، ۱۹۴۷ء کے بعد کی صورت حال اور اس کی پیدا کردہ افراتفری، ان میں سے کسی مسئلہ کو چکنی چپڑی لگا کر پٹانے کی مذموم کوشش کے بجائے ان کا ذمہ دارانہ، سنجیدہ اور داخلی مطالعہ، ناول کی سہ سمتی میں ایک چوتھی سمت کا اضافہ کرتا ہے۔ ان میں سے بیشتر مسائل ایسے ہیں جن پر آج تک کھل کر گفتگو نہیں ہوئی ہے۔ خاموشی کی اس سازش یا خوف وخرابی کی اس فضا میں ان نکتوں کا چھیڑنا اور ان کا بھرپور جائزہ لینا ادبی دیانت کا ایسا کارنامہ ہے جس پر اردو ادیبوں کو فخر کرنا چاہیے۔"

جب کہ جمال احمد پاشا کی رائے اس سے مختلف ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ :

"یہ ناول فنّی اور تکنیکی اعتبار سے بہت کمزور ہے۔ اس میں نظریاتی اعتبار سے بڑی کمزوریاں ہیں۔ پھر وہ اتنے بڑے کینوس کو سنبھال نہیں پائے ہیں۔ ان کے بعد کے ناولوں میں "مدار" اور "گھروندا" بہت اچھے اور بھرپور ناول ہیں۔ فنّی اعتبار سے گھروندا نے انھیں بڑے ناول نگاروں کی صف میں شامل

کر دیا ہے۔"

دراصل حیات اللہ انصاری کا کانگریسی کمٹ منٹ" لہو کے پھول" میں پوری طرح چھایا ہوا ہے۔ کمیونسٹ اور مسلم لیگی کرداروں سے وہ انصاف نہیں کر پائے یہاں حیات اللہ کی فن کارانہ چابک دستی مجروح ہوتی ہے جبکہ "مدار" اور "گھروندا" میں ان کا فن کہیں مجروح نہیں ہوتا ہے۔ ان میں قبائلی، آدی باسی اور بنجاروں کی زندگی کے مسائل پیش کیے گئے ہیں گھروندا میں بنجاروں کی عکاسی اور ترجمانی اتنی حقیقت پسندانہ ہے کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اس کا مصنف بذات خود بنجارہ ہے اور اپنا اور اپنے معاشرے کا حال بیان کر رہا ہے۔ قبائلی زندگی کا جتنی گہرائی اور گیرائی سے مشاہدہ اور جس باریک بینی سے تجزیہ کیا ہے بھرپور کردار نگاری کے ساتھ ہی زبان کا جس خوبصورتی اور حقیقت پسندانہ انداز میں فن کارانہ استعمال کیا ہے اس سے بحیثیت ناول نگار اردو کے افسانوی ادب میں حیات اللہ صاحب نے ایک اہم مقام حاصل کر لیا۔

حیات اللہ انصاری اردو افسانہ کے میدان میں اس وقت آئے جب اردو افسانہ موضوعات اور زبان و بیان کی تبدیلی کے دور سے گزر رہا تھا۔ ہندی اردو کہانی کی تاریخ جس طرح انشاء کی کہانی" رانی کیتکی کی کہانی" سے شروع ہوتی ہے اسی طرح اردو ہندی میں جدید افسانے کے آغاز کا سہرا پریم چند کے سر بندھا۔ پریم چند نے ۱۹۰۵ء میں افسانے لکھنا شروع کر دیے تھے۔ افسانوں کا پہلا مجموعہ "سوز وطن" کے نام سے ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے اس میں حب الوطنی، قومیت اور سماجی اصلاحات کو پہلی بار موضوع بنانے کی کوشش کی گئی تھی یہ مجموعہ نواب رائے کے نام سے شائع ہوا تھا نواب رائے سے وہ پریم چند بنے۔ سفر جاری رہا۔ ۱۹۲۹ء میں مادھوری کے ایڈیٹر بنے لیکن اسے بھی وہ اپنے ترقی پسند سیاسی و سماجی تصورات کا ترجمان نہ بنا سکے۔[۵۳]

۱۹۳۵ء میں لندن میں اور اس کے ایک سال بعد ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں انجمن

ترقی پسند مصنفین کی بنیاد پڑی۔ جس کی صدارت پریم چند نے کی۔ اس خطبۂ صدارت اور اردو کے ساتھ ہندی میں بھی لکھنے کی وجہ سے پریم چند کا نقارہ کچھ اس طرح بجا کہ اردو ہندی کے افسانوی ادب میں کسی کی طوطی بولنا تو دور رہا جو چند آوازیں تھیں وہ بھی توجہ نہ پا سکیں۔ ورنہ حقیقت تو یہ تھی کہ تب تک۔

"افسانہ سر کے بل کھڑا تھا اور اس کا انداز کرتب کا تھا شروع شروع میں ایسا محسوس ہوا کہ پریم چند بھی ایسی ہی کرتب بازی کے لیے ایک بازی گر ثابت ہوں گے.... ان کی نظر فن پر کم سے کم تھی۔ مواد ان کے لیے سب کچھ تھا۔ اس لیے ان کے افسانے تحلیل کے افسانے بن سکے۔ ان کے یہاں زندگی ایک سپاٹ سی چیز ہے جس کے سامنے کچھ مسائل کھڑے ہیں۔ لیکن زندگی خود ایک مسئلہ ہے اس کی طرف ان کی توجہ نہیں گئی.... لیکن پریم چند نے جتنا بھی کیا اور جو کچھ بھی کیا وہ بڑا کام تھا۔ اردو افسانے کی دستار فضیلت پریم چند کے ہی سر بندھنی تھی، چنانچہ دورِ آخر میں انھوں نے ایک افسانہ "کفن" لکھ ڈالا.... "کفن" کو افسانوی ادب کا ایک لاثانی نمونہ ہونا تھا، اس لیے جدید اور جدید ترین فنی تقاضوں کے پس منظر میں یہ افسانہ صحیح سالم نظر آتا ہے۔"[۹]

حقیقتاً ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۶ء تک کا زمانہ اردو کے افسانوی ادب میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔ ان چھ برسوں میں اردو ادب نے چھ دہائیوں کا سفر طے کیا۔ اسی دوران اختر حسین رائے پوری نے ہندی میں لکھنا شروع کیا اور اپریل سنہ ۱۹۳۲ء میں ہندی ماہنامہ "وشوامتر" میں ان کا مضمون "ساہتیہ اور کرانتی" چھپا۔ جس نے ہندی حلقوں کو چونکا دیا... یہ بڑی حیرت کی بات ہے کہ اردو میں نہ تو کسی نے اس کا ترجمہ کیا اور نہ ہی موضوع بحث بنا۔ مولوی عبدالحق نے اسے جولائی ۱۹۳۵ء کے شمارہ میں شائع کیا تو اس نے نئی نسل کو بے حد متاثر کیا۔ لیکن ادب اور زندگی"

اردو میں انقلاب کے لفظ اور انقلاب کے تصور کو رائج اور عام کرنے میں اختر حسین رائے پوری کا بڑا ہاتھ ہے جس کا اعتراف کرنے میں خاصے بخل سے کام لیا گیا۔[10]
اسی طرح کا سلوک ترقی پسند ناقدین اور جدیدیت کے علمبرداروں دونوں نے حیات اللہ صاحب کے ساتھ کیا۔ ان کا پہلا افسانہ "بڈھا سود خوار" جامعہ دہلی میں ۱۹۳۲ء میں چھپا۔ عنوان کے مطابق موضوع ہی نہیں بلکہ تکنیک سے لے کر زبان و بیان اور اندازِ فکر تک نیا (جدید) تھا۔ حیات اللہ صاحب کا کہنا تھا کہ انھوں نے اسے ۱۹۲۸ء میں لکھا تھا۔ کئی جگہ بھیجا لیکن کہیں شائع نہیں ہوا۔ کیوں کہ یہ اپنے آپ میں پرانی روش سے ہٹ کر تھا۔ ان کا یہ بھی دعوا تھا کہ ان کا یہ افسانہ "جدید ترقی پسند" افسانے کا سنگِ بنیاد ہے۔[11]
تیسری دہائی کے آخر میں غیر ملکی افسانوں، انگریزی، فرانسیسی، روسی ترکی وغیرہ کے بہترین افسانوں کے ترجمے بڑے پیمانے پر اردو میں شائع ہوئے۔ ان ترجموں نے ہی اردو افسانے کو رومانی، تصوراتی، شاعرانہ قید سے آزاد کر کے حقیقت کا سامنا کرنے کی راہ دکھائی۔ اس راہ کا پہلا مسافر کون ہے حیات اللہ، پریم چند یا کوئی اور ؟ اس پر گہرائی اور گیرائی سے تحقیق ہونا ابھی باقی ہے۔
ابھی تک زیادہ تر ناقدین پریم چند کو اولیت دیتے ہیں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ پریم چند کا اردو کے ساتھ ہی ہندی میں بھی لکھنا، کسی بھی ناقد، ادیب اور سیاست داں سے ان کی چپقلش نہ ہونا، اس کا انھیں فائدہ ملا، جبکہ حیات اللہ کمٹ منٹ (گاندھیائی اور کانگرسی) کے ساتھ ہی متعدد محاذوں پر سرگرم تھے، جس کی وجہ سے وہ روزِ اوّل سے ہی متنازعہ بن گئے۔ جہاں تک کمٹ منٹ کا سوال ہے، کمٹ منٹ ایک نہایت سنجیدہ عمل ہے اور انفرادی آزادی کی طرح مقدس ہے۔ دراصل آزادیِ ضمیر اور کمٹ منٹ ایک ہی سکے کے دو پہلو ہیں۔ ایک کے بغیر دوسرے کا وجود قطعاً بے معنی ہے۔ اس لیے میرے خیال میں ادب میں کمٹ منٹ کی بحث کو صحیح سمت میں لے جانا بہت ضروری ہے۔

ترقی پسند ادب کے نظریہ سازوں نے اس تحریک کے دور اول میں کمٹ منٹ کو پارٹی پروگرام سے جوڑ دیا تھا اور اسی وجہ سے مخالفوں کو کمٹ منٹ کو نشانہ بنانے کا موقع ملا۔[۱۲] اور اسی وجہ کے ساتھ یہ بھی ہوا کہ ہمارے چند بزرگوں نے انتہا پسندی کو اپنا لیا اور اچھے بھلے ترقی پسند ادیبوں پر تحریک دشمنی کے الزامات اس حد تک لگائے گئے کہ وہ یا تو تحریک سے الگ ہو گئے یا خاموش ہو گئے۔[۱۳] لیکن حیات اللہ صاحب چپ بیٹھنے والوں میں نہیں تھے۔ اس لیے انھیں ترقی پسند ناقدین کا نشانہ بنا لازمی تھا وہ بے بس اور بے آواز بھی نہ تھے۔ وہ "ہندستان" اور پھر "قومی آواز" جیسی آواز کے ساتھ ہی گاندھیائی فکر و عمل، درسِ نظامی کے منطقی دلائل اور کانگرسی وسائل سے مالا مال تھے۔

آزادی کے ساتھ ہی کمیونسٹوں اور کانگریسیوں میں فکری اور عملی کشاکش بڑھی۔ کمیونسٹ پارٹی کے اندر کی کش مکش بھی سامنے آگئی۔ پرانے کانگرسی رفیقوں نے جن میں پنڈت نہرو بھی شامل تھے۔ ۴۷-۱۹۴۶ء میں زبردست کمیونسٹ مخالفت مہم چلائی اور خود کمیونسٹ پارٹی نے رندیوے کی سرکردگی میں جوشی کی معزولی کے بعد جو انتہاپسندانہ پالیسی اپنائی اس نے حالات میں زبردست تبدیلی کر دی۔ جن میں اب تک ترقی پسند تحریک کام کرتی آئی تھی۔[۱۴]

۱۹۴۹ء میں بھیمڑی کانفرنس اعلانیہ سے یہ دوری اور بڑھی۔ اعلانیہ میں کہا گیا تھا کہ کانگرس حکومت ایک طرف لوٹ مار کرنے والے طبقے کی حفاظت کر رہی ہے تو دوسری طرف برطانوی اور امریکی سامراج کے ساتھ مل کر ہندستان کے جمہوری حقوق کو سلب کر رہی ہے مزدوروں، کسانوں اور متوسط طبقہ کی جدوجہد کو دبانے کی بھرپور کوشش کر رہی ہے اور دوسری طرف تہذیب و تمدن اور ادب کے بارے میں وہی رویہ اختیار کرتی ہے جو جرمنی اور اٹلی میں فاشسٹوں نے اختیار کیا تھا۔[۱۵]

اس اعلانیہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ہندستان کے تاریخی پس منظر کی نہیں روسی انقلاب کے پس منظر کی ترجمانی اور پروپیگنڈہ زیادہ کر رہا ہے۔ اس لیے اس حقیقت

کو نظر انداز کیا گیا ہے کہ ہندستانی عوام اور کسان بنیادی طور پر جاگیردارانہ اور زمینداری نظام کے مظالم اور استحصال کے شکار ہیں یہاں سرمایہ دارانہ بورژروائی نظام کی وہ طبقاتی کشمکش نہیں تھی جو انقلاب روس کا باعث بنی تھی۔ ہندستان میں "منظم حلقہ مزدور" بھی برائے نام اور محض چند شہروں تک محدود تھا، جس کی بنا پر کسی سرخ انقلاب کا آنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔ ہندستان میں ضرورت تھی ایک جمہوری پرامن سماجی اور اقتصادی انقلاب کی، جس کا راستہ گاندھی جی نے دکھایا تھا۔ یہ وہ حالات تھے جنھوں نے حیات اللہ صاحب کے ذہن میں موجود مارکسی اور گاندھیائی کشاکش کو ختم کر کے کمیونسٹ مخالف اور مکمل طور پر گاندھیائی بنا دیا۔ ان کا قلم اور ان کی آواز ترقی پسندوں کے باہمی اختلافات اور آویزش کو بے نقاب کرنے کے لیے وقف ہو گئی۔ نتیجے میں ترقی پسند ناقدین، جن کی اس وقت اردو ادب اور تنقید پر اجارہ داری قائم تھی، نہ صرف حیات اللہ صاحب کو نظر انداز کیا بلکہ ان کے ساتھ بے انصافی بھی کی۔

حیات اللہ صاحب کے افسانے اس دور کے لحاظ سے جدید اور ترقی پسند افسانے کے اولین نمونے ہیں یہ افسانے حقیقت نگاری کے بہترین مرقعے ہیں۔ ان میں سماج کے دبے کچلے طبقے، افراد اپنے صحیح پس منظر اور حقیقی خدوخال میں سانس لیتے نظر آتے ہیں۔ آخری کوشش۔ ڈھائی سیر آٹا۔ سہارے کی تلاش، کمزور پودا۔ بھرے بازار میں۔ ماں بیٹا۔ موزوں کا کارخانہ۔ مبارک ہو اور نکیرا ان کے فن کے چند نادر نمونے ہیں۔ "ڈھائی سیر آٹا" اردو کا اولین مارکسٹ افسانہ قرار دیا گیا۔ لیکن "آخری کوشش" میں حیات اللہ انصاری کا فن حقیقت نگاری کی ان بلندیوں پر پہنچ گیا ہے جہاں تک پریم چند کی بھی رسائی نہیں ہو سکی ہے "کفن" اردو کا مکمل اور شاہکار افسانہ کہلانے کے باوجود حقیقت نگاری کے معاملے میں "آخری کوشش" سے بہت پیچھے ہے[16]

ڈاکٹر صادق کے اس تجزیے اور پروفیسر وہاب اشرفی کے تجزیہ (حوالہ[9])

کو ایک ساتھ دیکھیں تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ حیات اللہ صاحب فنی اعتبار سے جدید اردو افسانے کی خشتِ اول رکھنے کے معاملے میں اولین حیثیت کے حق دار ہیں۔

" حیات اللہ صاحب نے اپنے افسانوی فن میں تین مختلف چیزوں کی اہمیت کو یکساں شدّت کے ساتھ محسوس کیا اور برتا ہے۔ ان کے افسانوں میں مشاہدۂ تخیل اور فکر تینوں کو برابر جگہ ملتی ہے۔ ان میں سے صرف ایک کے سہارے پر چلنا انھوں نے نہیں سیکھا۔ جہاں مشاہدہ ہے وہاں تخیل بھی ہے اور فکر بھی۔ ان کا کوئی افسانہ ان تینوں چیزوں کے بغیر مکمل ہی نہیں ہوتا۔ اپنے فن کے ساتھ اس درجہ انہماک اور خلوص کی مثال اردو افسانہ نگاروں میں حیات اللہ انصاری سے زیادہ کہیں اور نہیں ملتی۔" ۲۷

بوژوا طبقے کو بے نقاب کرنے کے ساتھ ہی اس کی حقیقی ترجمانی بھی حیات اللہ انصاری نے پریم چند سے بہتر کی ہے۔ پریم چند ہمیشہ اس تذبذب میں مبتلا رہے کہ کیا یہ طبقہ (متوسط) سیاسی تحریکات کی رہنمائی کرتے ہوئے حقیقی طور پر مزدوروں اور کسانوں کی بہبود کے لیے کام کر سکے گا؟ انھوں نے عوام اور خواص کے مشترکہ دکھ درد کو تلاش کر کے اس کے مابین زیادہ مضبوط رشتہ تلاش کرنے کی کوشش کی تھی مگر وہ بورژوا ذہنیت سے اچھی طرح واقف نہیں تھے۔ حیات اللہ نے "شکستہ کنگورے" میں پہلی مرتبہ اس بورژوا طبقے کی ذہنیت کو بے پردا کرنے کی کوشش کی ہے۔" ۲۸

حیات اللہ صاحب افسانوں کی تکنیک کے ساتھ ہی اس کی روح کو بھی سمجھتے ہیں زبان و بیان پر پوری دسترس اور قدرت رکھنے کی وجہ سے ان کے افسانے فنی، تکنیکی اور موضوع کے اعتبار سے شاہکار تو ہیں ہی، نئی فکر و آہنگ کے بھی بے مثال نمونے ہیں۔ مشاہدۂ فکر اور تخیل کا جو حسین امتزاج ان کے افسانوں میں ملتا ہے وہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے اگر وہ سڑک پر چلتے ہیں اور سڑک کے کنارے کوئی جھونپڑی دیکھتے ہیں تو لمحوں کے اندر وہ ایک غریب اور بے کس بن کر اس جھونپڑی میں برسوں

رہ لیتے ہیں۔ ان کی آمدنی کم ہو جاتی ہے وہ بوسیدہ لباس میں یا ننگے بدن اس جھونپڑی کی سیلی زمین پر لیٹ بھی لیتے ہیں۔ وہیں ان کے اَن پڑھ، میلے کچیلے بچے پلتے اور بڑھتے ہیں۔ وہیں ان پر پولیس مظالم بھی ہوتے ہیں۔ جھونپڑی اجاڑی جاتی ہے۔ وہ بے گھر ہو جاتے ہیں۔ لمحوں میں حیات اللہ اس کرب سے گزر جاتے ہیں۔ اس کے بعد اس جھونپڑی اور اس کے مکینوں پر جب حیات اللہ افسانہ لکھنے بیٹھتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے ایک پوری زندگی اس جھونپڑی میں جی لی ہے مہینوں تنکا تنکا جمع کر کے اس آشیانے کی تعمیر کی ہے۔ اس میں صدیوں ایک روشن مستقبل کے خواب دیکھے ہیں۔

اس طرح حیات اللہ صاحب نے ہندستان کا جس حقیقی پس منظر میں باریک بینی سے مشاہدہ کیا ہے اور اپنے افسانوں کو جیسا فنی عروج بخشا ہے اسے چاہے جس نظریے سے پرکھا جائے، نتیجہ ایک ہی نکلے گا کہ حیات اللہ اردو کے افسانوی ادب کے میر کارواں ہیں۔ پریم چند اردو کے افسانوی ادب پر "غالب" ضرور ہیں۔ لیکن میر اور غالب کے اپنے اپنے حدود و مطالب ہیں ان کی تشریح چاہے جیسے کی جائے ان کے بنیادی مفاہیم میں کوئی اضافہ ممکن نہیں۔ "میر کارواں" کی حیثیت پر کوئی غالب تو ہو سکتا ہے۔ قابض اور غاصب نہیں۔ حیات اللہ صاحب اردو کے اولین مارکسی افسانہ نگار ہیں۔ جدید اردو افسانہ کی خشت اول بھی انھوں نے ہی رکھی، اس لیے انھیں اردو افسانہ کا میر کارواں تسلیم نہ کرنا بددیانتی بھی ہوگی اور بے انصافی بھی۔ (بہ شکریہ نیا دور)

حَواشی:

۱، ۲ نظم میں "جائیں گے" ہے

۳ معلم اردو: حیات اللہ انصاری نمبر اداریہ ص ۵

۴ عابد سہیل: کچھ یادیں کچھ باتیں۔ معلم اردو حیات اللہ انصاری نمبر ص ۹

۵ گربچن داس چندن: قومی آواز کے معمار اول " " " ص ۴۳

[6] ڈاکٹر خلیق انجم: حیات اللہ انصاری پر ایک مذاکرہ۔ دہلی اکتوبر ۱۹۸۵ء

[7] زمانہ۔ پریم چند نمبر ص ۴۵

[8] پروفیسر قمر رئیس: پریم چند کا تنقیدی مطالعہ ص ۵۵

[9] پروفیسر وہاب اشرفی: ترقی پسند اردو افسانہ

[10] کمال احمد صدیقی: ترقی پسند تحریک اور لکھنؤ

[11] حیات اللہ سے ایک گفتگو: اظہار احمد

[12] اصغر علی انجینئر: ترقی پسند ادب۔ نظریاتی بنیادیں

[13] عاشور کاظمی: لندن میں گولڈن جبلی تقریب میں پیش رپورٹ سے ایک اقتباس

[14] رالف رسل: ص ۹۷

[15] بھیمڑی کانفرنس کا اعلانیہ ۱۹۴۹ء ص ۷۵

[16] ڈاکٹر صادق: ترقی پسند افسانے کے پچاس سال ص ۶۲۔ ۳۶۱

[17] پروفیسر وقار عظیم: نیا افسانہ ص ۱۰۶۔ ۱۰۵

[18] پروفیسر عظیم الشان صدیقی ایک مذاکرہ دہلی ۱۹۸۵ء

■■

حیات اللہ انصاری

اپنے تجربات کے آئینے میں

آج دوشنبہ ہے اور ۱۹۹۷ء کے ماہ مارچ کی ۳۱ تاریخ، آج سے چار دن قبل اردو صحافت کی عمر ۱۷۵ برس کی ہوچکی ہے اور آج کی تاریخ میں وہ ۱۷۵ برس ۴ دن مکمل کر رہی ہے۔ کیونکہ ۲۷ مارچ ۱۸۲۲ء کو اردو کا پہلا اخبار 'جام جہاں نما' کلکتہ سے شائع ہوا تھا۔ تب سے آج کے عہد تک بقول کہنہ مشق و بزرگ صحافی مسٹر احمد سعید ملیح آبادی کہ "اردو صحافت حجری دور سے نکل کر اب کمپیوٹر کے عہد میں داخل ہو چکی ہے۔

آج ہم اردو صحافت کے تناظر میں جس عظیم شخصیت یعنی حیات اللہ انصاری صاحب پر گفتگو کرنے کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں، انھوں نے اردو صحافت کا حجری دور بھی دیکھا ہے اور کمپیوٹر کا عہد زریں بھی۔ آج کمپیوٹر کے عہد میں اردو صحافت نے جو ترقیاں کی ہیں وہاں تک کامیابی کے ساتھ لانے میں حیات اللہ انصاری صاحب کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔

انھوں نے جب ہفتہ وار 'ہندستان' نکالنا شروع کیا اس وقت جس قسم کی صحافت، زبان اور پیش کش کا جو طریقہ رائج تھا وہ بالکل روایتی اور عبارت عربی و فارسی کے الفاظ سے بوجھل ہوا کرتی تھی۔

اردو زبان اس عہد میں تیزی سے بدل رہی تھی۔ اس تغیر اور تبدل کی تصویر اس زمانے کے ادبی شہ پاروں میں آج بھی دیکھی جاسکتی ہے لیکن اردو صحافت چہ جائیکہ اس تبدیلی کو قبول کرتی وہ اپنی قدیم ڈگر پر ہی چل رہی تھی۔ اردو صحافت کو اس پرانے راستے سے ہٹا کر جدید شاہراہ پر لانے کا کام حیات اللہ انصاری صاحب نے کیا انھوں نے اس کے لیے ہفتہ وار ہندستان میں نئے تجربے کرنے شروع کر دیے تھے جن کا خاطر خواہ جواب بھی ملا۔ انصاری صاحب بنیادی طور پر ایک فن کار بہترین کریفٹس مین ہیں۔ وہ چاہے صحافت کا میدان ہو، ادب کا ہو یا زبان و تعلیم کا وہ ایک ماہر فن کار کی طرح اپنے موضوعات پر سوچتے، غور کرتے اور انھیں عملی جامہ پہناتے ہیں۔ دنیا میں اس قسم کے تجربے بڑے بڑے لوگوں نے کیے اور پھر اسے آنے والے وقت پر چھوڑ دیا کہ وہ اسے قبول کرنا ہے یا نہیں لیکن حیات اللہ صاحب کے سارے تجربات اسی زمانے میں ہی کامیابی سے ہمکنار ہوئے اور انھیں خود آج وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

صحافت کے میدان میں ان کا سب سے پہلا اور بڑا تجربہ ہفتہ وار "ہندستان" تھا جس کے املے سے روایت کے برخلاف حرف "واو" غائب کر دیا تھا۔ اس پر کچھ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو اعتراض تھا۔ ہندو کہتے تھے کہ "واو" کے اخراج سے حیات اللہ انصاری صاحب نے ہندوئیت سے اعراض کیا ہے، جب کہ مسلم طبقہ کا کہنا تھا کہ انصاری صاحب اردو کو بگاڑ رہے ہیں وہ ایک مستند اور مروجہ املا توڑ رہے ہیں۔

ان سب کو حیات اللہ صاحب نے جو جواب دیا وہ اس طرح تھا کہ "خود ہندی والے جب ہندستان لکھتے ہیں تو (ہ) پر چھوٹے (उ) کی ماترا لگاتے ہیں نہ کہ بڑے (ऊ) کی، اس طرح وہ میرے املے کی تتبع کرتے ہیں۔ اسی طرح اردو والوں سے کہا کہ لفظ ہند سے ہندستان ہے نہ کہ (ہندو) سے۔

جب وہ 'ہندستان' ایڈٹ کر رہے تھے روزنامہ اخبار کی ڈمی ان کے ذہن

جنم لے چکی تھی اور اس سلسلے میں بہت سے منصوبے، طریقے اور طباعت و گٹ اپ کا نقشہ ذہن میں بنا چکے تھے۔ جب جدید ہند کے معمار اعظم اور ملک کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے انگریزی روزنامہ نیشنل ہیرالڈ اگست ۱۹۳۸ء میں جاری کیا اور اس کے کچھ برسوں بعد پنڈت جی نے ہفتہ وار ہندستان کو جو انھیں کا تھا روزنامہ میں تبدیل کیا تو حیات اللہ انصاری صاحب نے اس کا نام قومی آواز رکھا۔ یہ نام جواہر لال جی کو بہت پسند آیا لیکن ساتھ ہی انھوں نے یہ اعتراض بھی کیا کہ حیات اخبار کا نام ہندستان ہی کیوں نہیں رہنے دیا انصاری صاحب نے جواب دیا کہ ہندی میں روزنامہ ہندستان دہلی سے شائع ہو رہا ہے ایسے میں یہ اچھا نہیں لگتا کہ ہندی ہندستان اور اردو ہندستان کے ناموں سے اخبارات کی شناخت بنے۔ اس پر پنڈت جی خوش ہوئے اور قومی آواز کے نام پر متفق ہو گئے۔

قومی آواز کو حیات اللہ انصاری صاحب نے اپنے تجربات سے جہاں نیا انداز اور نیا گٹ اپ دیا وہیں اسے نیا تیور بھی دیا جو عصری حسیت سے بھرپور تھا اور زمانے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنی باتیں کہتا تھا۔

اس اخبار نے زندگی کی بھرپور ترجمانی شروع کی اور سماج پر ہمیشہ اثر انداز بھی ہوا۔ انصاری صاحب کی فکری بصیرت اور عالمانہ اسلوب تحریر نے اخبار کو چار چاند لگا دیے، قومی آواز نے ان فکری بنیادوں تک پہنچنے کی کوشش کی جن پر صحافت کا دار و مدار رہتا ہے۔ قومی آواز اور حیات اللہ صاحب کی قومی خدمات کو کوئی نظر انداز نہیں کر سکتا ہے۔ اخبار نے ابتدائی دور میں ہی ان تمام روابط اور مسائل کا احاطہ کیا جو ہندستانی باشندوں اور مغربی آقاؤں اور زوال پذیر ہندستانی حکمرانوں، جاگیرداروں کے مابین سیاسی، تہذیبی اور فکری سطح پر کشمکش کا باعث بنے ہوئے تھے نیز آزادی سے قبل اور ذرا بعد تک دو قومی نظریہ سے نبرد آزما رہا اور جیت حیات اللہ انصاری کی ہوئی کیونکہ ان کی تحریروں کا اثر بہت سی سمتوں پر پڑا۔

حیات اللہ صاحب نے اگر عوام کے اندر قومی جذبات کو اُبھارا تو وہیں
نڈر ہو کر عام کمزوریوں کو بھی بے نقاب کیا۔ انھوں نے صحافت کو مشغلہ
یا پیشہ نہیں بلکہ اپنا مقصد حیات بنایا اور یہی وجہ تھی قومی آواز ایک مدت تک
سخت مالی دشواریوں کا شکار رہا اور ایک وقت وہ بھی آیا جب اردو اخبار
کی بقا کی خاطر جناب حیات اللہ انصاری صاحب نے صرف ایک روپیہ ماہوار
پر کام کیا اور اس کا سلسلہ ۱۸ ماہ تک برقرار رہا۔ اس عرصہ میں ان پر ان کے
کنبہ پر کیا نہیں بیتی انھیں فاقوں سے گزرنا پڑا اور ایک بھیانک وقت
انھوں نے یہ بھی دیکھا جب اس دوران ان کی منجھلی اولاد جو ایک نوزائیدہ بچّی
تھی دوا اور مناسب علاج نہ ہونے کی بنا پر اس دار فانی سے روٹھ کر اپنے
خالق حقیقی کی گود میں جا بیٹھی۔ ان سب کے باوجود حیات اللہ صاحب نے
وقت اور حالات سے کبھی سمجھوتا نہیں کیا ان کی جدوجہد جاری رہی۔

حیات اللہ صاحب نے سب سے پہلے قومی آواز کی زبان کی جانب
توجہ دی جو ملکی اردو اخبارات کے اسلوب زبان و ادب سب سے جُدا تھی۔
انھوں نے آسان، صاف ستھری اور سادی زبان استعمال کی۔ عربی اور فارسی
کے ثقیل الفاظ سے احتراز کیا۔ اس کے علاوہ ہندی اور انگریزی کے بہت
سے الفاظ شامل کیے۔

اردو کے املے کی بھی اصلاح کی گئی، بہت سے الفاظ کا مشکل عربی و
فارسی املا توڑ کر خالص ہندستانی مزاج کے مطابق کیا جسے اردو کا رسم خط
آسانی سے قبول کر لے۔

انجمن ترقی اردو کے صدر جب پنڈت کشن پرشاد کول بنے اور ان کے
بعد ڈاکٹر ذاکر حسین اور دتا تریہ کیفی نے بھی اردو املے کی جانب توجہ دی اور
فارسی تراکیب اور عربی اضافتیں ختم کی گئیں۔ بقول خود حیات اللہ انصاری صاحب
کے کہ اس طرح کوئی ڈھائی سو الفاظ کی تطہیر ہوئی۔

اس عہد کے اخبارات کا زور الفاظ کی گھن گرج پر تھا فارسی کے الفاظ شان بڑھانے کے لیے استعمال کیے جاتے تھے، لیکن قومی آواز نے معنویت پر زور دیا۔ اسی لیے بچگان کی جگہ بچے، بیوگان کی جگہ بیواؤں اور خواتین کی جگہ عورتیں جیسے آسان الفاظ استعمال ہونے لگے۔ یہی حال اداریوں کا بھی تھا۔ ان کی شروعات ہی عربی فارسی کے بوجھل الفاظ سے ہوتی تھی۔ حیات اللہ صاحب نے سادے جملوں اور آسان الفاظ سے اداریے لکھنے شروع کیے۔ عبارت کی رنگینی اور لفاظی اس زمانے کا عام طریقہ تھا اس سے قومی آواز نے اپنا دامن بچایا اور اس نے موضوع سے موضوع صرف بحث کی۔

جرنلزم میں گٹ اپ اور ٹائپوگرافی کو بڑی اہمیت حاصل ہے، اس جانب حیات اللہ صاحب نے خاص توجہ دی انھوں نے ہفت روزہ ہندستان کے زمانے سے جو غور و فکر کرنا اور ایک نقشہ بنانا شروع کیا تھا اسے قومی آواز کے وجود میں آتے ہی تجربے کے مراحل سے گزارا اور اس میں وہ صد فی صد کامیاب رہے۔

چونکہ اردو نستعلیق کے ٹائپ نہیں تھے اس لیے اس کی کتابت کے سلسلے میں کوئی اصول نہیں تھا، جو اردو اخبارات اس زمانے میں شائع ہو رہے تھے ان کی سرخیوں میں زبردست فرق ہوا کرتا تھا، ایک صفحہ پر ۲ کالمہ یا ۳ کالمہ سرخی جس قلم سے لکھی ہے دوسرے صفحہ پر اسی طرح کی سرخی کا قلم دوسرا ہوتا تھا نیز ان میں الفاظ بھی کم اور زائد ہوتے تھے۔ اس خامی کو حیات اللہ انصاری نے خالص اپنے تجربہ اور فکر سے دور کیا اور قلم میں یکسانیت لانے کے لیے سرخیوں میں الفاظ کی تعداد مقرر کی نیز کون سا قلم کس سرخی کے لیے کتنا موٹا اور پتلا ہوگا اس کی تخصیص کی اور خط کی باقاعدہ صراحت کر دی، مثلاً ایک کالمہ سرخی کی پہلی سطر میں پانچ الفاظ ہوں گے، اس سے زائد نہیں ہونے چاہیئے۔ دو کالمہ سرخی میں سات اور تین کالمہ میں نو(۹) الفاظ ہوں۔ اسی طرح چار، پانچ اور چھ کالمہ وغیرہ سُرخیوں کے الفاظ اور خط طے کیے۔ سرخیوں کے لیے یہ قید رکھی گئی تھی کہ الفاظ

سیدھے سبک اور ایک سطر میں ہوں اس زمانے کے اردو اخبارات کی مروجہ سرخیوں کی طرح ایک لفظ دوسرے پر چڑھا ہوا ہرگز نہ ہونا چاہیے۔ اس کی وجہ تھی کہ کم اردو پڑھا لکھا شخص بھی آسانی سے پڑھ لے۔ سرخی اس لیے پہیلی نہ ثابت ہو کہ قاری کو یہ سوچنا پڑے کہ تلے اوپر لکھے گئے جملے میں پہلے وہ کیا پڑھے؟ یا پھر اسے کسی لال بجھکڑ کی مدد لینی پڑے۔

سُرخی کے لیے یہ ضروری کیا گیا کہ خبر کی جان یا اہم بات اس میں خاص کر پہلی سطر میں آجائے اور قاری سرخی پڑھ کر ہی پوری خبر سمجھ لے۔

اس زمانے میں ملکی سیاست کو دو قومی نظریہ بُری طرح آلودہ کر رہا تھا، جس کے توڑنے کے لیے ہمارے قومی لیڈر بابائے قوم مہاتما گاندھی کی قیادت میں دن رات جدوجہد کر رہے تھے انھیں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے حیات اللہ انصاری صاحب نے صحافت میں نئی اصطلاح سازی شروع کی جو دو قومی نظریہ کا مخالف اور قومی یک جہتی کا علم بردار تھا مثلاً اس زمانے میں اردو اخبارات، مسلم ناموں کے ساتھ 'جناب' اور ہندوؤں کے ناموں کے ساتھ 'شری' کا استعمال کر کے ہندو مسلم کی تفریق اور بڑھا دیتے تھے، اسی طرح عورتوں کے ناموں کے لیے 'محترمہ' اور 'شریمتی' کا استعمال کرنے لگے تھے۔ حیات اللہ انصاری صاحب نے اس روایت سے بغاوت کی اور ہر مذہب و ملّت کے لیے لفظ 'مسٹر، مسز اور مس' کو رائج کیا۔ پہلے لوگوں کو اس کا احساس کم ہوا لیکن اس کے اثرات بعد کو بڑے گہرے پڑے۔ اسی طرح معززین کے لیے لمبے چوڑے القاب و آداب استعمال کرنے کی روایت تھی اسے بھی قومی آواز نے توڑا اور بڑی سے بھی بڑی شخصیت کے لیے خوشامد آمیز اعزازی کلمات یا القاب کا استعمال نہیں کیا۔

خبر بنانے کا فن، انٹرویو لکھنے کا طریقہ، پیراگراف بنانا وغیرہ ان سب کے لیے حیات اللہ صاحب نے اصول مرتب کیے۔ صحافت کے میدان میں وہ

جو کچھ بھی سوچتے فکری اعتبار کے علاوہ تکنیکی اعتبار سے بھی وہ اس کا تجربہ ضرور کرتے اور اس کی کامیابی کے بعد اسے نوٹ کر کے ایک رجسٹر تیار کرایا تھا جس پر وہ ہدایت چسپاں کرا دیتے۔ اس طرح یہ رجسٹر اہم ہدایات اصولوں اور تجربات سے بھرا پڑا تھا۔ یہ رجسٹر عرصہ تک دفتر قومی آواز میں موجود تھا جس کا کاتب، سب ایڈیٹر اور پروف ریڈر حضرات بغور مطالعہ کرتے اور ان اصول وضوابط پر عمل کرتے۔ عملہ فن صحافت کا درس خاص طور پر نئے آنے والے یہیں سے حاصل کرتے تھے۔

سرخیوں اور ٹائپوگرافی سے متعلق ہدایات کے نمونے کے چارٹ کی شکل میں قدیم دفتر کے چوبی پارٹیشن سے لٹکے رہتے تھے، جسے وقتاً فوقتاً اسٹاف والے بغور دیکھتے۔ ان چارٹوں وغیرہ کو دیکھنے پڑھنے اور سیکھنے کا شرف راقم الحروف کو بھی حاصل ہوا ہے۔

پرانے دفتر کی عمارت جب ٹوٹی اور اس کا سامان نئی عمارت میں منتقل ہوا تو جو بہت سی قیمتی اشیا جو تلف ہو گئیں ان میں یہ بیش بہا خزانہ، یہ رجسٹر اور چارٹ بھی تھے جن کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ کاش اس رجسٹر کو کتابی شکل مل گئی ہوتی تو فن صحافت کی بہترین کتاب ثابت ہوتی۔

حیات اللہ صاحب نے گٹ اپ پر خاص توجہ دی اور اخبار کو جدید انگریزی اخبارات کی شبیہ دی۔ فلیش کے شروع پیراگراف کو پاشاں لکھوانا، خبر کی سرخی تیار کرنا، دو کالمہ یا تین کالمہ خبروں کو آمنے سامنے نہ لگنے دینا، دونوں کے درمیان ایک کالمہ خبر کا حد فاصل ہونا لازمی قرار دیا، دل چسپ اور اہم خبروں کو حلقے میں لکھوانا۔ تصاویر اور کارٹون کا استعمال ضروری قرار دیا۔ لیتھو کی طباعت میں تصاویر کا چھاپنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا لیکن اس پر حیات اللہ صاحب نے بڑے کامیاب تجربے کیے۔ انھوں نے تصاویر کے بلاک کو کتابت کی روشنائی سے پیلے کاغذ پر جربہ اتروا کر تصاویر چھاپنے کا

تجربہ کیا تو وہ بہت کامیاب رہا اور اس زمانے کے قومی آواز کی چھپی ہوئی تصاویر آج کی آفسیٹ پرنٹنگ سے کہیں بہتر ہیں۔

حیات اللہ صاحب نے اخبار کا رشتہ براہ راست قاری سے جوڑنے کے لیے مراسلات کا بڑا مضبوط کالم رکھا تھا اور کالم کے ذریعہ لکھنے والوں کو پوری آزادی تھی۔ حیات اللہ صاحب کی ادبی شخصیت کی بنا پر قومی آواز کے دو تین کالم اور ہفتہ وار میگزین بلا مبالغہ کسی نہ کسی نئی ادبی، علمی اور تحقیقی بحث کے لیے وقف رہتے تھے اس کا سلسلہ آج بھی برقرار ہے اور ہمارے ادبا و دانش ور سر پھٹول کے لیے تیار رہتے ہیں یہ کارنامہ بھی حیات اللہ صاحب کا ہے اس زمانے میں جب کوئی بحث بہت سنگین ہو جاتی تھی تو حیات اللہ صاحب مولانا عبدالماجد دریا بادی، پروفیسر مسعود حسن رضوی یا نیاز فتح پوری کو حرف آخر کے بطور حکم بنا دیتے۔ پروفیسر عبدالعلیم، پروفیسر آل احمد سرور، ڈاکٹر احتشام حسین اور ڈاکٹر محمد حسن وغیرہ سب نے ہی مختلف اوقات میں اختلافی موضوعات پر اپنی اپنی رائے دی ہے۔ کاش یہ بحثیں اور مضامین کتابی شکل میں شائع کی جاتیں (اس لیے میں اردو اکادمی کے چیرمین سے گزارش کروں گا کہ وہ اس خزانے کو منظر عام پر لائیں)۔

قومی آواز پورے ہندستان میں بڑے بڑے ادبا، شعرا اور دانشوروں کے پاس جاتا تھا اور وہ لوگ بھی گاہے بگاہے ان کالموں میں اظہار خیال کرتے تھے۔ قرۃ العین حیدر، دیوندر ستیارتھی، یشپال، امرت لال ناگر، بھگوتی چرن ورما غرضیکہ سبھی ہندی اور اردو کے ادیب اکثر ادبی و لسانی مسائل پر قومی آواز کو ہی وسیلۂ اظہار بناتے تھے اور اس کا سہرا حیات اللہ انصاری کے سر بندھتا ہے کہ انھوں نے اخبار کو ایک ادبی، علمی اور تحقیقی انجمن بنا دیا تھا۔ اخبار اگرچہ کانگریس پارٹی کے نظریات کا حامل تھا لیکن حیات اللہ صاحب ہر مخالف پارٹی یا لیڈر کی رائے کا نہ صرف احترام کرتے تھے بلکہ اسے اپنے نقطۂ نظر

کی وضاحت کا پورا موقع بھی دیتے تھے۔ انھوں نے کبھی عملہ پر اپنے کو افسر ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ سب کے ساتھ بیٹھ کر بحث و مباحثہ میں حصہ لیتے تھے۔ اس سلسلے میں حیات اللہ صاحب کے ایک ساتھی اور قومی آواز کے سابق رکن مرحوم حسن واصف عثمانی ان کے لیے کسی کا مقولہ دہرایا کرتے تھے کہ بڑا آدمی وہ نہیں ہے جو اپنے بڑے پن کا رعب دوسرے پر ڈالے، عظیم اور بڑا وہ ہے جس سے مل کر آپ خود اپنے کو بڑا محسوس کرنے لگیں اور یہ بات حیات اللہ صاحب سے ملنے کے بعد محسوس ہوتی ہے۔

حیات اللہ صاحب کا ایک یہ بھی بڑا کارنامہ تھا کہ قومی آواز کے ذریعہ انھوں نے اردو کو علاقائی زبان بنانے کی تحریک چلائی اور اسے عوامی تحریک میں بدل دیا اور جب اکثر ادیب زبان کے مستقبل سے مایوس ہو چکے تھے حیات اللہ صاحب نے تن تنہا اس پودے کو خون پسینے سے سینچ کر ہرا بھرا رکھا، انھوں نے اس کے لیے آئینی جد و جہد کی اور فرقہ پرستوں نے ان پر اس زمانے میں قاتلانہ حملہ بھی کیا۔

حیات اللہ صاحب کا ایک اور بڑا کارنامہ ہے جو قومی آواز کے توسط سے کیا کہ سرحد پار سے آنے والوں اور مقامی لوگوں میں ایسی ہم آہنگی اور مفاہمت پیدا کی کہ لکھنؤ میں کوئی بھی ہندو مسلم تصادم کی نوبت نہیں آئی۔ کالم ''اندھیر نگریوں'' انھیں پناہ گزینوں کے لیے شروع ہوا تھا جو بہت مقبول ہوا کیونکہ اس کالم نے عوام کو بتایا کہ یہ پناہ گزیں عام قسم کے انسان ہیں۔ وہ خطرناک نہیں بلکہ ستائے ہوئے مظلوم لوگ ہیں۔ بعد میں انھیں پناہ گزینوں میں سے کئی لوگ حیات اللہ صاحب کی اردو تحریک سے جڑے اور اردو کی بقا کے لیے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

اسی طرح اپنے ادبی شہ پاروں میں بھی جگہ جگہ صحافی حیات اللہ نظر آتے ہیں، چاہے وہ لہو کے پھول کا مضبوط ترین کردار راحت ہو یا حال کا

ناول بدار گاؤں خفیہ پولیس کا ایجنٹ جولاماؤں کی بستی میں جاتا ہے اس کی حیثیت ایک صحافی اور وقائع نگار کی ہے۔ اگر حیات اللہ صاحب کے ادبی شہ پاروں پر غور کیا جائے تو سب زندگی کی سچی تصویریں نظر آئیں گی اور پڑھنے والا محسوس کیے بنا نہیں رہتا ہے کہ "ارے اس کردار کو تو میں نے دیکھا ہے یا اس سے تو میں مل چکا ہوں"۔ یہ کردار سازی انھوں نے اپنے گہرے مشاہدے، مطالعہ اور تجربے سے کیا ہے۔ مثال کے طور پر ان کے پہلے افسانوی مجموعہ "بھرے بازار میں" کے ٹائیٹل افسانے کو کلکتہ کے فٹ پاتھوں پر بیٹھ کر غریب بستی کا تقریباً ڈیڑھ برس تک مطالعہ کرنے کے بعد لکھا۔ انھوں نے وہ سب کچھ وہاں دیکھا جو انسانی جبلّت کی عکاسی کرتی ہے اور پہلی بار انھوں نے نیا تجربہ کیا۔ وہ خوبصورتی کے بجائے جسم پر توجہ تھی جو ایک غریب محنت کش عورت کا گوشت پوست اور ہڈیاں تھیں جسے سماج کے امیر لوگ بھوکی نظروں سے گھور رہے تھے۔

تعلیم بالغان کے میدان میں ان کا ایک انوکھا تجربہ تھا جو بالغ اور بچّے کے لیے یکساں ثابت ہوا اور دس دن میں اردو و دس دن میں ہندی ان کے ۲۸۔۳۰ برسوں کی انتھک محنت اور کاوش کا نتیجہ ہے جو ملک کے کونے کونے میں رائج ہے اور ماہرین تعلیم نے اس طریقۂ تعلیم کا لوہا مانا ہے۔ آج بھی وہ اپنی کبر سنی کے باوجود اردو زبان کی خدمت میں مصروف ہیں۔ بیٹے سدرت اللہ انصاری کو گھنٹوں نوٹ اور ہدایات لکھایا کرتے ہیں اور اس پر کتنا عمل ہوا کہ حساب بھی لے لیتے ہیں۔

ان سب کے باوجود حیات اللہ انصاری صاحب نے کبھی بھی اپنی ذات سے متعلق لاکھوں اعتراض ہونے پر بھی کوئی جواب نہیں دیا اور نہ صفائی، یہ ان کا اپنا اصول ہے کہ میں اپنی ذات سے متعلق کوئی صفائی نہیں دیتا۔

ابھی حال ہی" ایک جگہ سردار جعفری نے لکھا کہ زمانۂ طالب علمی میں

آفتاب ہال مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایک بار جب پنڈت جواہر لال نہرو تشریف لائے تو حیات اللہ انصاری میدان چھوڑ کر کھسک گئے تھے۔"

اس سلسلے میں انھوں نے کچھ نہیں کہا جب راقم الحروف ان کے بیٹے سدرت اللہ انصاری اور بہو شہناز سدرت نے بہت اصرار کیا تو ہنس کر جواب دیا کہ ہر ذی ہوش جانتا ہے کہ ہمارے اور پنڈت جی کے کیا رشتے تھے اس لیے اس قسم کی باتوں پر کوئی اعتبار نہیں کرے گا اور کہنے والا خود شرمندہ ہوگا۔

حیات اللہ نے ذکر کیا کہ میرے بارے میں جواہر لال جی نے پنڈت گووند بلبھ پنت کو لکھا تھا کہ حیات کا خیال رکھیں کیونکہ میں تو انھیں پسند ہی کرتا ہوں گاندھی جی بھی انھیں بہت پسند کرتے ہیں Gandhiji also like him.

پنڈت جی کے خطوط جو کتابی شکل میں آئے ہیں یہ خط اس میں موجود ہے۔

حیات اللہ صاحب نے بتایا واقعہ یہ ہے کہ علی گڑھ میں زمانۂ طالب علمی میں آفتاب مجلس جس کا میں صدر تھا پنڈت جی کو دعوت دینے دہلی گیا کہ آپ الہ آباد جا رہے ہیں راستے میں علی گڑھ تشریف لائیں اور آفتاب مجلس نیشنلسٹ طلبا کی انجمن ہے سب آپ کے مداح ہیں اور پروفیسر حبیب صاحب نے بھی خواہش ظاہر کی ہے وہ ہال کے انچارج ہیں کہا کہ رات کا کھانا ان کے یہاں کھائیں اس سلسلے میں پنڈت جی نے کہا کہ پہلے مولانا آزاد سے میں پوچھ لوں۔ جب پنڈت جی نے مولانا سے دریافت کیا کہ حیات آئے ہیں کیا مجھے جانا چاہیے؟ تو مولانا نے کہا کہ ہاں بھئی اگر پروفیسر حبیب نے دعوت دی ہے تو ضرور جائیں۔ حیات اللہ صاحب نے بتایا جب پنڈت جی کو لینے کے لیے میں اسٹیشن گیا تو وہاں سر راس مسعود اور تقریباً درجن بھر پروفیسر بھی ان کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ وہ اسٹریچی ہال گئے سر راس مسعود نے بہت چاہا کہ پنڈت جی کھانا ان کے یہاں کھائیں لیکن انھوں نے کہا کہ میں پروفیسر حبیب کا مہمان ہوں ہاں چلئے آپ کی پی لوں گا۔ پنڈت جی نے

جائے سردار اس مسعود کے ساتھ پی لیکن رات میں کھانا انھوں نے پروفیسر حبیب کے یہاں کھایا۔ سردار جعفری نے اس تقریب میں خواجہ احمد کی شمولیت کا ذکر کیا ہے جو بے بنیاد ہے، خواجہ صاحب کا اس سے کوئی تعلق نہیں وہ تھے ہی نہیں۔

حیات اللہ نے مسکراتے ہوئے کہا کہ بھئی میں بھاگوں گا کیوں، میں تو نظریاتی اور عملی طور پر پارٹی اور پنڈت جی کے قریب تھا بلکہ اس دن ایک جگہ بھیڑ میں میں ذرا پیچھے ہو گیا تو پنڈت جی رک گئے مڑ کر دیکھا اور پوچھا ارے حیات کہاں رہ گئے بھئی۔

یہ تھیں اس خاموش، کم گو لیکن قلم کے عظیم سپاہی کی زندگی کی کچھ تصاویر جن کی روشنی میں ان کے تجربات کو نمایاں کرنے کی ناچیز نے کوشش کی ہے اور ——— ''گر قبول افتد زہے عزّ و شرف''

حیات اللہ انصاری

اُردو صحافت کی روشنی میں

جدید ہندستان کی تاریخ میں موجودہ صدی کی چوتھی، پانچویں دہائی کی خاص اہمیت ہے۔ ایک ہی وقت میں بہت تابناک اور المناک واقعات اِن دہائیوں میں رونما ہوئے۔ ان واقعات نے ہماری سماجی زندگی پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں نیز زندگی کے بارے میں ہمارے، ہم سے پہلے کی نسلوں کے تصور اور نظریہ کو بنانے میں اہم رول ادا کیا۔ ایک طرف اگر ملک کو آزاد کرانے کی مہم اپنے عروج پر پہنچ کر کچھ معاملات میں کمزوری و بے سمتی کا ثبوت دے رہی تھی تو دوسری طرف آزادی کے غیر واضح و مبہم تصوّر کے خلاف بغاوت کا جذبہ بھی عام ہو رہا تھا۔ سماج کے مختلف طبقات میں کچھ کر گزرنے کی بے چینی گہری ہو رہی تھی۔ سوال یہ تھا کہ آزادی بھوک، غریبی، ظلم، استحصال، ذہنی پستی اور نظریاتی و فکری غلامی سے یا آزادی فرسودہ معاشی سماجی نظام سے یا آزادی خالص رنگ و نسل کے غیر ملکی سامراج پرستوں سے؟ آزادی ادھورے خواب جیسی کوئی چیز ہے یا پورے چاند جیسی کوئی تعبیر۔ آزادی تالاب کا ٹھہراؤ ہے، ندی کا پھیلاؤ ہے یا سمندر کی بے قراری کو قرار آجانا ہے؟

ہماری تاریخ کی یہ بھی روشن حقیقت ہے کہ بیشتر اردو اخبارات و جرائد آزادی کا جو تصوّر پیش کر رہے تھے اور جس کے لئے وہ اپنی تمام تر صلاحیتوں کو کام میں

لا رہے تھے اس میں الجھاؤ اور ابہام کم سے کم تھا۔ ان اخبارات میں ہندستان ویکلی کو نمایاں مقام حاصل تھا۔ حیات اللہ انصاری جس کی مجلس صدارت کے اہم رکن تھے، انھیں اس کا مدیر بھی کہہ سکتے ہیں۔ دراصل زندگی کو اس کی تمام تر وسعتوں اور سماجی نظام کو سبھی پہلوؤں کے ساتھ سمجھے بغیر آزادی کے صحیح مفہوم تک رسائی ممکن نہیں۔

ارجن کی مانند چڑیا کی آنکھ کو واحد ٹارگیٹ نہ بنائیں تو ادب کی ترقی پسند تحریک نیز اسٹیج فن کاروں کی عوامی مہم جس کی پُشت پناہی عام طور پر ایک خالص سیاسی نظریے کے افراد کر رہے تھے، وہ آزادی کا جو تصور پیش کر رہی تھی اس میں ہمارے سماج کے تمام تر طبقات کی تسکین کا سامان بھلے نہ ہو لیکن ہندستانی عوام کی امیدوں پر پورا اُترنے والا ضرور تھا۔ حالانکہ جن کے اردو صحافت پر بہت سے احسان ہیں بہ بانگ بلند اس سیاسی، سماجی نظریہ سے اختلاف ظاہر کرتے رہے ہیں۔ باوجود اس کے ادب اور صحافت کے بارے میں ان کے نقطۂ نظر کی تشکیل میں اِس نظریہ کا کچھ دخل ضرور رہا ہے۔

ہندستان ویکلی کی منتشر شدہ مجلسِ ادارت کی یاد تازہ کیجیے، ڈاکٹر عبدالعلیم اور کنور محمد اشرف جیسے مضبوط ارادوں والے مارکس وادی، گاندھی وادی حیات اللہ انصاری کے ساتھ شانہ بہ شانہ کھڑے نظر آتے ہیں۔ ادب اور سیاست کی ترقی پسند تحریک پر گہری چھاپ چھوڑنے والی ان شخصیات کے اثر سے حیات اللہ صاحب چاہے جتنی شدّت سے انکار کریں مگر حقیقت یہ ہے کہ حیات اللہ صاحب کی زبان میں کچھ الفاظ ان حضرات کے بھی شامل ہیں۔

میری نظر میں حیات اللہ انصاری کا سب سے بڑا صحافتی کارنامہ، اردو صحافت کو سیکولر مزاج کا آئینہ بنانا اور اس کی زبان کو عوامی فہم کی سطح تک لے آنا ہے۔ ایسا اس لئے ممکن ہو پایا کیونکہ عوامی مسائل میں حیات اللہ صاحب کی دل چسپی شروع جوانی سے ہی بہت زیادہ رہی۔ عوامی تحریکوں سے بھی

ایک خاص طرح کا جذباتی اور ذہنی لگاؤ ہمیشہ بنا رہا۔ نہ صرف صحافت بلکہ ان کا افسانوی ادب بھی ایسی شہادتوں سے بھرا پڑا ہے۔ میں سمجھتا ہوں ان کے شاہکار افسانہ 'آخری کوشش' کی زبان ایک تخلیقی معجزہ ہے۔ ایسے معجزات صحافت کے میدان میں بھی ان سے رونما ہوتے رہے ہیں۔ یعنی ان کے صحافی اور افسانہ نگار میں دور کا فاصلہ نہیں تھا۔

انھوں نے اردو صحافت میں ہنگامی سیاست، مذہبی جذباتیت اور ذاتی پسند ناپسند پر اصول پرستی اور اجتماعی مفاد کو اہمیت دے کر صحافت میں فکر و نظر اور عوامی اتحاد کو نمایاں مقام دلانے کا جو تاریخی کارنامہ انجام دیا اس میں کسی حد تک اُس سیاسی سماجی نظریہ کا دخل ضرور ہے جس کی مخالفت میں انھوں نے کوئی کسر باقی نہ رکھی۔ عربی کی کلاسیکی شاعری کے مطالعہ اور گاندھیائی تحریک سے ذہنی و جذباتی وابستگی نے بھی صحافت اور ادب کے بارے میں ان کے منفرد نقطۂ نظر کو پختگی بخشی۔ اپنے مارکس وادی ساتھیوں سے جہاں انھوں نے سماجی مساوات اور ذہنی کشادگی کا شعور حاصل کیا تو گاندھیائی تحریک میں شرکت اور گاندھی جی کے آشرم میں رہ کر انھوں نے سب سے محبت اور سب کی عزت کا درس لیا۔

روایت کی پاسداری کرتے ہوئے نیز عوام کے جذبات کا لحاظ رکھتے ہوئے بھی 'قومی آواز' جس آب و تاب سے عصری تصورات کو فروغ دیتا رہا اُس سے بھی اِس اثر کا کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

انھوں نے روایت پسند جذباتی قاری کو نہ صرف جدید تقاضوں کی آگہی بخشی بلکہ جدید ٹکنالوجی کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے قومی آواز کو جدید مطالبات کا مقابلہ کر سکنے کی صلاحیت بھی عطا کی۔ جس سے عصری اور بعد کی اردو صحافت نہ صرف متاثر ہوئی بلکہ اس نے نئی طاقت بھی حاصل کی۔

اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ جن دنوں بیشتر ہندی اخبار مسلم مخالف جذبہ کو تقویت دے کر فرقہ واریت کو ہوا دے رہے تھے 'قومی آواز'

بنیاد پرستوں اور مذہب کی سیاست کرنے والوں سے مورچہ لے رہا تھا اور سیکولر خیالات کی تشہیر میں پیش پیش تھا۔ زیادہ تر اردو اخبار آج کے پُر آشوب ہنگامی دَور میں اگر فرقہ واریت کے خلاف مثبت اور مضبوط رویے کا ثبوت دے سکے تو اس کا سہرا یقینی طور پر حیات اللہ کے سر جاتا ہے۔ باوجود کوششوں کے اگر لکھنؤ میں امن کا ماحول بگاڑا نہیں جا سکا تو اس میں کچھ رول 'قومی آواز'' اور حیات اللہ صاحب کا ضرور ہے، انھوں نے بہت سارے منھ توڑے، بُت بھی توڑے۔

ان کا ایک بڑا کارنامہ اردو صحافت کو محدود دائرے سے نکال کر اُسے نئی وسعتوں سے روشناس کرانا ہے۔ اردو اخبارات میں ترجمے پہلے بھی ہوتے تھے، حیات اللہ صاحب نے ترجموں کو خالص اردو کی چیز بنا دیا۔ انھوں نے انگریزی اخباروں کی طرز پر اداریہ کو ضروری اہمیت دلائی ـــ ان کے دَور میں 'قومی آواز' کے اداریہ کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ ڈیلی اخبار میں اداریہ کا کیا رول ہوتا ہے اور وہ کس طرح خاموشی سے ایک مہم کا حصہ بن جاتا ہے۔ حیات اللہ صاحب کے بعد روزنامہ 'عزائم' کے ایڈیٹر جناب جمیل مہدی صاحب مرحوم نے اس کی بہت اچھی مثال پیش کی۔

ایک بڑا ادیب مدیر بن کر کس طرح اخبار کی پوری کائنات پر اثر انداز ہوتا ہے، اس کی کئی متعدد روشن مثالیں کئی ہندی اخبارات نے پیش کی ہیں۔ اردو میں حیات اللہ صاحب کے دَور کے 'قومی آواز' کے علاوہ حیات، چنگاری اور نیا سویرا وغیرہ کے نام لے سکتے ہیں۔ اخبار کی دنیا سیاسی سرگرمیوں اور مخصوص سماجی واقعات تک محدود نہیں ہے، اُسے انسان کی پوری سماجی زندگی کا آئینہ ہونا چاہیئے۔ ثقافتی، علمی سرگرمیوں اور ادبی بحثوں کو 'قومی آواز' میں نمایاں مقام دے کر حیات اللہ صاحب نے صحافت کے لیے یقیناً نئی راہیں کھولیں۔

★★

سدرت اللہ انصاری
(حیات اللہ انصاری کے صاحبزادے)

حیات اللہ انصاری کی خصوصیات

کچھ دنوں قبل حیات اللہ انصاری صاحب پر کچھ لوگ ریسرچ کرنے آئے تھے جن کا تعلق حیات اللہ انصاری صاحب کی صحافت سے تھا۔ انھوں نے جب لکھنؤ کے خاص اردو والوں سے حیات اللہ انصاری صاحب کی صحافت پر سوال کیے تو جواب دینے کے بعد یہ پوچھا گیا کہ آپ نے حیات اللہ صاحب کی ناولیں اور افسانہ نگاری چھوڑ کر بہت بڑی غلطی کی۔ اصل چیز تو چھوڑ گئے۔ اسی طرح کا سوال ان لوگوں سے پوچھا گیا جنھوں نے مرحوم کی افسانہ نگاری پر ریسرچ کرنی چاہی تھی۔ حیات اللہ انصاری صاحب ماہر تعلیم بھی تھے۔ تعلیم چاہے وہ ابتدائی تعلیم ہو یا غیر رسمی تعلیم دونوں میں بخوبی دخل تھا۔

غیر رسمی تعلیم میں ان کی مہارت کا اندازہ اس طرح سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے "دس دن میں اردو" پڑھائے جانے کے ڈھنگ کی وجہ سے چودہ یونیورسٹی نے مجھے چیف ریسورس پرسن کے طور پر بلایا۔

ان کا افسانہ "ڈھائی سیر آٹا" پریم چند سے پہلے آچکا تھا۔ اردو صحافت میں ان کی ایک رہنما کی حیثیت ہے، انھوں نے یہ تک بتایا کہ اخباروں میں سرخی کیسی ہوگی، خبر لکھی کیسے جائے گی پہلے صفحہ کی بناوٹ اور اس کے تین کالم کی سرخی اور دو کالم کی سرخی کس طرح ہوگی اور کتنے الفاظ ہوں گے، خبروں کی بناوٹ کیسی ہو کہ پڑھنے والے اس کو چھوڑ نہ پائیں۔ پہلا صفحہ اور ایڈیٹوریل کا صفحہ کس قسم کا ہو، بڑی سے بڑی

بات آسان سے آسان لفظوں میں کہی جائے، اپنے بڑے سے بڑے مخالف کی خبریں، آرٹیکل، مراسلے، سب کو شائع کرنا اور اگر ضرورت ہو تو جواب دینا یعنی ہر پارٹی کا اس اخبار پر پورا حق تھا اور ایڈیٹر سے سوال طلب کرنے کا بھی پورا موقع دیا جاتا تھا۔

یہ وہ چیزیں تھیں جو صحافت کے معیار کو بلند کرتی ہیں اور اس زمانے میں رائج نہیں تھیں۔ انصاری صاحب ان سب کو اس خوب صورتی سے لے کر آئے تھے کہ مجبورًا سارے اردو اخباروں کو اپنے طور طریقے کو بالکل بدل دینا پڑا اور ایک نئی سمت میں سارے اردو اخبار چل پڑے۔

ایک زمانے میں "قومی آواز" کی غلطیوں کو دور کرنے کے لیے آفس میں نوٹس بورڈ لگا دیا گیا اور اس پر لکھ دیا جاتا تھا کہ صبح آئے ہوئے اخباروں میں کیا کیا کمیاں تھیں جس میں سُرخی سے لے کر خبروں کو بنانے، املا کی غلطی تک کی غلطیوں کو لکھا جاتا تھا۔ یہ نوٹس بورڈ اتنا مشہور ہو گیا کہ "نوجیون" اور "نیشنل ہیرالڈ" والے بھی آکر دیکھنے لگے اور اس کا چرچا جب دوسرے اردو اخباروں میں ہونے لگا تو نوٹس بورڈ کی جگہ ایک رجسٹر نے لے لی (افسوس کہ "قومی آواز" آفس بدلتے وقت یہ رجسٹر غائب ہو گیا)۔

افسانہ نگاری میں حیات اللہ انصاری کی خوبی مسئلے کو پکڑنے، اس کو بہت معمولی اور عام پائے جانے والے کرداروں کے درمیان رکھ کر بہت آسان زبان میں بڑی سے بڑی بات کہتے ہوئے منظر کشی اس طرح سے کرتے تھے کہ گویا سب آنکھوں کے سامنے سے گذرتا جا رہا ہے۔ اور جب یہ خوبی ان کی بہت بڑے مواد کو لے کر چلی، تو ناول "لہو کے پھول" ۲۶۱۸ صفحوں میں سمائی۔

سوال یہ اٹھتا ہے کہ یہ ساری خوبیاں ایک انسان میں کیوں کر سما گئیں۔

اس پس منظر کو دیکھنے کے لئے ہمیں حیات اللہ انصاری کے اس دور میں جانا ہو گا جب وہ بے سہارا فرنگی محل کے ایک چھوٹے سے گھر میں رہ رہے

تھے۔ مدرسہ درس نظامی کے طالب علم بھی تھے اور اسی مدرسے میں چھوٹی کلاسوں کو پڑھاتے بھی تھے معمولی آمدنی سے صرف ان کے کھانے کا خرچ چلتا تھا۔ لیکن اپنی سوجھ بوجھ سے خود کا بنا یا ہوا صوفہ گھر میں رہتا تھا اور گھر مناسب طریقے سے آراستہ بھی تھا۔ شام کا وقت ہرن پارک میں لوگوں کی باتیں سنتے ہوئے گذرتا تھا۔ یہاں پر حیات اللہ انصاری صاحب نے جو عام سے کردار چُنے، انھوں نے ان کا ساتھ افسانوں اور ناولوں میں ہر جگہ دیا اور جو اس وقت کی ہرن پارک کی عام بحثوں نے بحث مباحثہ کا طریقہ، اپنی بات رکھنے کا ڈھنگ، کس کی بات لوگ غور سے سنتے ہیں اور کس کی بات نہیں سنتے تو کیوں؟ اس طرح اردو کی نفیس لکھنوی زبان نے حیات اللہ انصاری کے ذہن پر اپنے اثرات چھوڑے اس کی مہک "قومی آواز" کے خبروں میں گلوریوں سے لے کر ایڈیٹوریل تک سب جگہ چھائی رہی۔

ابھی جو بہت اہم سوال ہے کہ آخر اتنی ساری خوبیاں حیات اللہ انصاری میں کیوں کر سما گئیں؟ اس کا جواب ابھی باقی رہ گیا۔ اسی ہرن پارک میں انھوں نے یہ دیکھا کہ چاہے وہ مسلمان ہو، ہندو ہو، یا کسی بھی ذات پات کا ہو لیکن اس کی تکلیف، بھوک، پریشانی، چوٹ، بیماری، اُلجھنیں سب کی تکلیفیں ایک سی ہوتی ہیں۔ ان سب کی وجہ سے وہ انفرادیت سے اُبھر کر انسانیت میں پہنچ گئے تھے، جہاں پر وہ انسانیت کی تکلیفوں کے حل نکالنے میں جُٹ گئے تھے۔ اسی انسانیت کی اُلجھنوں کو سُلجھانے کے لئے وہ افسانہ نگاری کے میدان میں اُترے تھے۔ تعلیم بالغان کی انتھک چالیس سال کی محنت کے بعد "دس دن میں اردو" و ہندی اسی مقصد کا نتیجہ ہیں۔ اس انسانیت کی پیچیدگیوں کو سُلجھانے کے لئے جو آسان ترین زبان انھوں نے استعمال کرنا شروع کی تھی وہ اتنی کامیاب رہی کہ قومی آواز کے ہزاروں قارئین نے اس کو پسند کیا۔

ایک موقع پر مرحوم حیات اللہ انصاری صاحب نے مجھ سے کہا تھا "بیٹا پیغمبر تو پیدا ہوں گے نہیں انسانیت کو فروغ دینے کی ذمہ داری اب صحافیوں اور ادیبوں کو نبھانی پڑے گی۔" ●●

شہناز سدرت
(بیگم سدرت اللہ انصاری)

میرے پیارے ابّو

حیات اللہ انصاری صاحب پر ہزاروں صفحے لکھے جا چکے ہیں اور لکھے جاتے رہیں گے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ لکھنے والوں نے اتنا لکھا ہے کہ حق ادا کر دیا ہے۔ ان کی زندگی میں میں نے بھی چند مضامین ان کی شخصیت پر لکھے تھے جن کے بارے میں خود حیات اللہ انصاری صاحب نے فرمایا تھا کہ "تم نے میری شخصیت کی وہ گرہیں کھولی ہیں جن کو میں خود بھول گیا تھا اور بعض باتیں تم نے وہ کہہ دی ہیں جو خواب معلوم ہوتی ہیں"۔

آج حیات اللہ صاحب کی زندگی اور شخصیت کے میں وہ پہلو آپ کو دکھانے جا رہی ہوں جو شاید ہی کسی کو معلوم ہوں۔ ایک کہانی میں آپ کو سناتی ہوں:

ایک دو سال کا بچہ تھا جسے بچپن میں ہی ماں داغ مفارقت دے گئیں۔ دادا دادی نے پالا۔ دادی بھی دو چار سال بعد چل بسیں۔ والد نے دوسری شادی کر لی۔ دوسری والدہ بے حد ظالم تھیں۔ دادا نے اپنی تحویل میں لے لیا۔ ۸ سال کا بچہ بڑا ہی کیا ہوتا ہے کہ دادا بھی گذر گئے۔ اب تنہا بچہ کیا کرے۔ اکیلا ہی اس بڑے گھر میں کھیلتا ہے، اپنے آپ سے باتیں کرتا ہے، کھلونے اپنے ہاتھوں سے بناتا اور توڑتا ہے، خاندانی مدرسے میں تعلیم حاصل کرتا ہے، وہیں عمر میں اپنے سے چھوٹے بچوں کو ٹیوشن پڑھاتا ہے اور اپنی گذر اوقات کرتا ہے۔ دھیرے دھیرے سال گذرتے ہیں۔ علمیت حاصل کرتا ہے اور ایک دن نہ جانے اس

کے دماغ میں کیا سودا سماتا ہے کہ وہ اچانک اپنے اس اکلوتے سرمائے یعنی اس گھر کو اپنے ایک عزیز کے ہاتھوں بیچ کر دس ہزار روپے پر مشتمل اثاثہ لے کر علی گڑھ یونیورسٹی جاتا ہے۔ ۱۹۲۲ء کا زمانہ ہے۔ روپے پرنسپل کے ہاتھ میں دے کر کہتا ہے کہ یہ میری زندگی کا سرمایہ ہے، میں تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہوں، آپ اسے اپنے پاس رکھ لیجئے اور مجھے تعلیم مکمل کرنے دیجئے۔ یہاں تک کہ وہاں سے بی اے کر لیتا ہے اور جب لکھنؤ واپس پہنچتا ہے تو نہ اس کے پاس رہنے کی جگہ ہوتی ہے اور نہ کہنے کو کوئی اپنا۔

یہ کہانی نہیں حقیقت ہے اور یہ سچائی ہے حیات اللہ انصاری کی۔ اس شخص کی، جس نے دو سال کی عمر سے اپنا آزمائشی دور شروع کیا اور آزمائشوں میں ہی پوری زندگی گذار دی۔

لوگوں کا خیال، جو میں عام طور پر محسوس کرتی آئی ہوں، وہ سوچتے ہیں کہ حیات اللہ انصاری منھ میں چاندی کا چمچہ لے کر پیدا ہوئے ہوں گے کیوں کہ ان کا تعلق تو فرنگی محل کے خانوادہ سے ہے، جہاں تحفے تحائف کی ریل پیل رہتی ہے، حکام جہاں سلام کرنے آتے ہیں، عمائدین شہر اپنی عزت سمجھتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ تھی کہ حیات اللہ صاحب کا بچپن بے حد کسمپرسی میں گذرا اور شاید یہی وجہ تھی کہ مزاجاً وہ صبر کے پیکر، شکر کے علمبردار اور سچائی کے منبع تھے۔ حسنِ اخلاق کی ایسی تصویر جو شاذ و نادر ہی نظر آئے گی۔ لوگ مانیں یا نہ مانیں میں انھیں ولی اللہ مانتی ہوں۔

زندگی کے بے حد اتار چڑھاؤ سے گذرے، بہت قریب سے انھوں نے زندگی کی سچائیوں کو دیکھا سمجھا اور پھر قلم اٹھایا اور قلم بھی ایسا اٹھایا کہ جس کی مثال نہیں۔ ابھی حال ہی میں جامعہ ملیہ کے ایک ریسرچ اسکالر اسلم جمشید صاحب نے لکھا ہے:

"حیات اللہ انصاری کا افسانہ "آخری کوشش" اردو کا ایک لازوال افسانہ ہے۔ آخری کوشش، "کفن" سے زیادہ کامیاب افسانہ ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا اگر

وہ اور کچھ بھی نہ لکھتے تو بھی ادب میں زندہ رہتے۔" (بحوالہ کتاب نما اگست ۲۰۰۰ء) ظاہر کرتا ہے کہ زندگی کی حقیقت کی سچائیوں کو انھوں نے سفاکانہ حد تک اجاگر کیا۔

میرا ان سے رشتہ یوں تو سمبر ہو والا تھا، مگر بقول ان کے میں ان کی ماں بھی تھی، بہن بھی اور بیٹی بھی تھی اور شاید اللہ نے حیات اللہ صاحب کے بڑھاپے کو عزت سے گزارنے کے لیے مجھے ان کے یہاں بھیجا تھا۔

مجھے انھوں نے جو بہت سی باتیں سکھائیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ لوگوں سے رشتہ داروں سے صرف اللہ کے لیے ملو، احسان کا رویہ رکھو اور بے لوث دوستی کرو۔ کسی کی مدد کرو تو یہ توقع رکھو کہ آگے چل کر یہ تم کو نقصان ضرور پہنچائے گا، کیونکہ ان کی زندگی کے تلخ تجربات نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ دنیا صرف مطلب کی ہے۔

حیات اللہ صاحب عظیم انسان تھے۔ اب ایسے لوگ پیدا نہیں ہوں گے وہ اپنی بہادری سے لڑتے ہوئے آسمان کی اونچائی تک پہنچے اور ایک عام انسان کی طرح پوری زندگی گذار کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ یہی وجہ تھی کہ جب ان کا انتقال ہوا اور اس وقت کے وزیر اعلیٰ کلیان سنگھ جی نے کہلایا کہ ہم ان کا اعزاز سرکاری طور پر کرنا چاہتے ہیں' تو ہم نے کہا کہ انھوں نے پوری زندگی ایک عام انسان کی طرح جی ہے اور اب ایک عام مسلمان کی طرح ہی ہم ان کو رخصت کرنا چاہتے ہیں۔ کسی سرکاری اعزاز کی ہمیں ضرورت نہیں۔ اسی لیے سدرہ صاحبہ نے طے شدہ پروگرام یعنی نماز مغرب سے پہلے ہی نماز عصر میں ان کی مٹی باغ مولوی انوار میں پہنچا دی کہ کوئی تڑک بھڑک نہ لگے۔

حیات اللہ صاحب کی زندگی کے کس گوشے پر روشنی ڈالوں اور کس کو چھوڑ دوں؟ سمجھ میں نہیں آتا۔ کیونکہ وہ ایسا روشن چراغ ہیں جو آنے والی نسلوں کے لیے مشعل راہ ہیں۔ جب کہ ان کے دور کے لوگوں نے ان کی اس عظمت سے ڈر کر انھیں اندھیرے گوشوں میں ڈھکیل دیا تھا۔ یہاں تک کہ لکھنؤ کی ادبی محفلوں میں ان کو بلایا تک نہ جاتا تھا کہ حیات اللہ انصاری اگر آگئے تو اوروں کی دکانیں بند ہو جائیں گی۔ مگر واہ رے اللہ! جس کو عزت دینا ہے بے شمار دیتا ہے اور یہی حیات اللہ صاحب کے ساتھ ہوا! وہ عزت سے جیئے اور عزت سے مرے۔

Bimonthly AKADEMI Lucknow

Nov. 2000 to April 2001

حیات اللہ انصاری مرحوم کی دو یادگار تصویریں

داہنی طرف سے (اوپر) علی جواد زیدی، امرت لال ناگر اور محمد رضوان علوی کے ساتھ

(نیچے) رام لعل، علی جواد زیدی اور محمد رضوان علوی کے ساتھ اکادمی کے زیر اہتمام

۷/۸/۹/ نومبر ۱۹۸۰ کو منعقدہ 'شامِ افسانہ' کے موقع پر

Rs. 24/-